گھٹن

(سیاسی، معاشرتی اور اندرونی گھٹن کی روداد)

شازار جیلانی

عکس
AKSPUBLICATIONS

shazar jelani 2012

گھٹن

(سیاسی، معاشرتی اور اندرونی گھٹن کی روداد)

شازار جیلانی

a special gift from shazar jelani

انتساب

اپنے والد فیروز شاہ کے نام،
جنہوں نے تربیت کے دوران میرے ساتھ کچھ ایسا کیا کہ ساری دنیا میں تقسیم ہونے والا درد پہلے میرے دل کے کوہ سینا پر اترتا ہے تب کسی اور کو ملتا ہے۔ لوگ خزاں کے مرجھائے ہوئے پھولوں کے ساتھ روتے ہیں تو میں پیچھے رہ جانے اور سردی میں ٹھٹھرنے والے کانٹوں کی تنہائی دیکھ کر افسردہ رہتا ہوں۔ درد کا احساس اور محسوس کرنے کا شعور دینے کیلئے اپنے داجی کا شکریہ۔

میری سادہ دل والدہ نورین کے نام،
جس نے زندگی بھر کوئی برا دیکھا ہی نہیں تھا، جو بروں کو مجبور سمجھتی تھی۔

بھری بہار میں مرجھانے والے میرے سعد کے نام، جس کی کمی عمر بھر کیلئے سینے کی گھاؤ بنی ہوئی ہے۔

سدرہ، حسن، شہریار، شاندانہ، ذلند، فاطمہ، اتل، سمون اور انابیسا کے نام جو میری کائنات ہیں۔

فہرست

پیش لفظ

برصغیر میں اردو صحافت میں مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولانا باقر علی جنہوں نے پہلا اردو اخبار جاری کیا تھا سزائے موت ہوئے۔ اس کے بعد سلسلہ چلتا رہا مولا محمد علی جوہر نے انگریزی اخبار کامریڈ شروع کیا۔ اور بابائے صحافت مولانا ظفر علی خان کے اخبار زمیندار کی دھومیں تھیں۔ ابوالکلام آزاد کے ساتھ مرد حریت مولانا حسرت موہانی اپنی صحافتی زندگی میں جیل یاترا میں آتے جاتے رہے۔ پاکستانی صحافت میں فیض احمد فیض احمد ندیم قاسمی۔ اور میاں افتخار الدین کے پروگریسیو پیپرز لمیٹڈ میں لکھنے والے شاندار صحافیوں اپنی ایک تاریخ۔ نوائے وقت جنگ تعمیر کوہستان کے علاوہ انگریزی اخبارات میں ڈان پاکستان ٹائمز دی مسلم اور فرنٹئیر پوسٹ دبدبے اخبارات تھے۔ اردو صحافت میں۔ کراچی سے پیر علی محمد راشدی جی الانا۔ ابراہیم جلیس شوکت صدیقی۔ رئیس امروہوی پنجاب میں مولانا کوثر نیازی شورش کاشمیری الطاف حسن قریشی ۔ حنیف رامے نذیر ناجی ۔ منوبھائی اے حمید ظہیر کاشمیری۔ پشاور میں فارغ بخاری شریف فاروق مسعود انور شفقی بڑے نام تھے۔

ہم نے جو صحافت دیکھی جس کے چسکے نے ہمیں اردو زبان میں مافی الضمیر قارئین تک کیسے ابلاغ کیا جاتا ہے اب وہ مفقود ہے۔ 1970 کی دھائی کے بعد کسی صحافی کی سیاسی تاریخی بالغ نظری زبان وبیان میں سادگی سیاسی اصطلاحات پہ دسترس اور حاوی کسی شخصیت کو پہلی دفعہ محترم شازار جیلانی کے روپ اور قلم میں دیکھا۔ نہ صرف پشتون قوم' قومیت کے

تاریخی ثقافتی پس منظر سے آگاہ بلکہ پنجابی سندھی اور بلوچی قومی کرداروں سیاست اور ان کے ادب و ثقافت اور سماجی تار و پود سے بدرجہا بہتر واقفیت نظر آئی وہ شازار جیلانی کے کالم میں جو پاکستان کے سوشل پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا پہ نام نہاد بزر جمہروں میں نظر نہیں آتی سوائے طنز و تشنیع اور گالم گلوج کے۔

محترم شازار جیلانی کا اسلوب صحافتی ہونے علاوہ زبان کے تناظر میں بھی صحافت کے میدان کے بڑے لوگوں کے مماثل ہے۔

گھٹن شازار جیلانی کے سیاسی ادبی ثقافتی اور تاریخی واقعات کے بے لاگ تجزیوں پر مشتمل کتابی شکل میں ایک دلیر حق گو حق پرست کی سوانح اور رومانوی فلم کی طرح دستاویز ہے۔ جو کالم بھی پڑھنے والا ایک دفعہ شروع کرتا ہے محسوس ہوتا ہے جیسے پردہ سکرین پر فلم چل رہی ہے۔ سیاسی کرداروں سے انتہا کی واقفیت واقعات کا مقامی و عالمی سیاسی معاشی تناظر میں ایک پشتون کا اردوداں طبقے کے لیے اردو زبان پہ دسترس کا انکشاف بھی ہے۔ نیشنل الیکٹرانک پرنٹ میڈیا پہ اینکروں اور مشروم کھمیوں کی غلط تلفظ قواعد زبان سے نابلد اردو سے دل و دماغ کی تھکن اتارنی ہو تو شازار جیلانی کی خالص پاکستانی شفاف اردو میں تحریروں کا لطف اٹھانا ہو تو گھٹن کا مطالعہ کیجئے جو صحافت اور سیاست کے طالب علموں کے کیلئے نصابی مضمون کے علاوہ علمی تحفہ ہے۔

صدیق منظر

خو شحال خان خٹک: پختون قوم پر ست یا مغل پر ور

مشترکہ زبان کے حامل اور پختون ولی کے عمرانی معاہدے میں بندھے ہوئے گروہ جو پختون کہلاتے ہیں، پختون ولی کو اکثر بھول جاتے ہیں لیکن تربوروَلی کو نہیں بھولتے۔ تربوروَلی شریکوں کو کہتے ہیں جن کو برباد کرنا آسان لیکن برداشت کرنا روایتی پختون معاشرے میں مشکل سمجھا جاتا ہے۔ یوسفزئی، جو اپنی مخصوص اور منفرد روایات کی وجہ سے پختونوں کے سٹف نک ارسٹوکریٹ کہلانے کے مستحق ہیں، پہلے کابل سے مغلوں کے ہاتھوں لٹے پٹے پشاور پہنچے اور پھر بابر کے سمدھی بن کر دہلی دربار میں بیٹھ گئے، لیکن بابر کے مرنے کے بعد اپنی نسلی عصبیت کی وجہ سے مغلوں کے ساتھ نہ چل سکے۔

خوشحال خان خٹک، اٹک پر مغلوں کے لئے چنگی وصول کرنے پر مامور تھے، جن کے والد کو یوسفزیٔ کے خلاف لڑتے ہوئے انہوں نے قتل کیا تھا، مغل ایماء پر یوسفزئیوں کو ہر قسم کا نقصان پہنچانے کے درپے رہتا تھا۔ مغلوں کی خاطر شاید ہی کسی اور پختون نے اتنے پختون قتل کیے ہوں جتنے خوشحال خان خٹک نے اکیلے قتل کیے ہیں۔ جب تک مالی غبن میں گرفتار ہو کر وہ اپنی مغل پروری کے ہتھے چڑھا نہیں تب تک اس نے یوسفزئی پختونوں کے خلاف مغلوں کو انگیخت کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کیا، حتیٰ کہ قید ہونے کے بعد مغل بادشاہ نے خوشحال خان کے بچوں اور خواتین کو بھی گرفتار کرنے کے لئے دستے بھیجے تو یوسفزئیوں نے خوشحال خان سے دشمنی کے باوجود پختون ولی کے جزبے کے تحت انہیں اپنے

علاقے میں پناہ دے کر مغلوں کے ناپاک ارادے کو ناکام بنایا۔

خوشحال خان مغلوں کی قید سے واپس آیا تو اس نے اپنے وہ مشہور زمانہ اشعار لکھے جو ان کے مزار پر بھی کندہ ہوئے ہیں، جن میں زبان زد عام یہ شعر ہے،

د افغان پہ ننگ می اوتڑلہ تورہ
ننگیالی د زمانے خوشحال خٹک یم

جس کا مطلب ہے کہ میں نے افغان یعنی پختون غیرت کے نام پر تلوار باندھ لی، میں زمانے کا غیرت مند خوشحال خٹک ہوں۔ جس کو آج پختون قوم پرست خوشحال خان کی پختون قوم پرستی کی نشانی کے طور پر دیکھتے ہیں، جبکہ دراصل یہ اشعار ان کا اعتراف جرم ہے، جو انہوں نے ایک معمولی چنگی کے بدلے برسوں مغلوں کی خدمت اور اپنے اندھے انتقام میں پختونوں کے خون سے ہاتھ رنگنے اور مغلوں کے ہاتھوں ذاتی توہین کا مزہ چکھنے کے بعد ایک سو اسی درجے کی قلابازی کھانے کے بعد لکھے۔

ان اشعار میں خوشحال خان یہ نہیں کہتے کہ میں نے پختون غیرت کے نام پر تلوار باندھی ہوئی ہے بلکہ وہ اعلان کرتے ہیں کہ میں نے مغل پروری سے تائب ہو کر اب پختون عزت اور غیرت کے نام پر تلوار باندھ لی۔ تاریخ سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ یہ اشعار خوشحال خان نے جوانی کے جوش اور پختونوں کی محبت میں نہیں لکھے بلکہ یہ کوئی پچاس سال کی عمر تک پختون دشمنی کرنے کے بعد اپنے کیے پر ندامت ظاہر کیے، بغیر محض ذاتی توہین کا بدلہ لینے کی خاطر لکھے۔ اگر وہ اپنی مغل پروری پر شرمندہ ہوتے تو ضرور ان پختون قبائل کے گھر جرگہ لے کر جاتے جن کے ساتھ انہوں نے مغلوں سے بڑھ کر زیادتیاں کی تھیں اور جنہوں نے ان سے دشمنی کے باوجود پختون ولی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے گھر کی عزت کو اپنے علاقوں میں پہنچا کر مغل فوج سے بچا لیا تھا۔

مغل قید سے چھوٹ کر آنے کے بعد وہ اس ہر علاقے اور قبیلے کے پاس گیا جہاں سے انہیں مغلوں کے خلاف مدد ملنے کی امید تھی، لیکن ان کے ماضی کے کردار کو دیکھتے ہوئے ان کے اپنے قبیلے اور بیٹوں کے ساتھ ساتھ، دوسرے علاقوں یا قبیلوں نے بھی بھاری

تعداد میں ان کے ساتھ کھڑا ہونا گوارا نہیں کیا۔ اس لیے وہ دور دراز کے قبائل میں جا کر اپنے ساتھی ڈھونڈنے نکلا۔

قریب کے لوگ اور قبائل جانتے تھے کہ خوشحال خان یہ سب کچھ مغلوں کی نظر میں اپنی عزت و اہمیت بڑھانے اور حیثیت بحال کرنے کے لئے کر رہا ہے اس لیے ساتھ نہیں دیا تو خوشحال خان نے اپنے اشعار کے ذریعے ان کی عزتیں ایسی تار تار کیں کہ آج تک ایک پختون قبیلہ دوسرے پختون قبیلے کو ان اشعار کے ذریعے لتاڑتا رہتا ہے۔ ان اشعار میں انہوں نے کسی کو کتے سے اور کسی کو گدھے سے بدتر قرار دے کر دل کا بوجھ ہلکا کیا تھا لیکن آج پختون سمجھتے ہیں کہ شاید یہ سچ ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ خوشحال خان محض ایک شاعر تھے، کوئی دانشور یا قوم کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس کے مسائل حل کرنے والے پیر روشان باچاخان یا شیر شاہ سوری تھوڑے تھے۔

وہ مغل لشکر کے آگے گھوڑا دوڑاتا ہوا جب پختون علاقوں پر حملہ آور ہوتا تھا تو تب بھی خود کو راست باز سمجھتا تھا اور جب مغلوں کے خلاف پختون لشکر اکٹھا کرنے میں ناکام ہوا تو ساتھ نہ دینے والے پختونوں کو کتے اور گدھے سے بدتر لکھتے ہوئے بھی خود کو راست باز کہتا رہا۔ پہلے وہ اپنی تلوار سے پختونوں کے سر اتارتا تھا اور اب اپنے قلم سے بھی ان کی پگڑیاں اتارنے لگا۔ تبھی تو پاکستان کے مقتدرہ قوتوں نے انہیں صاحب سیف و قلم مشہور کرایا ہے، اور وہ اس لیے کہ انہوں نے اپنی تلوار اور قلم دونوں کو پختونوں کو نقصان پہنچانے کے لئے استعمال کیے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ وہ پختون قوم پرست نہیں تھا تو اتنا مقبول کیسے ہوا کہ پختون قوم پرست انہیں اپنا ہیرو پختون دانشور انہیں شاعر بے بدل اور عام پشتون ان کی محبت میں اپنے بچوں کے نام ان کے نام پر رکھتے ہیں، جبکہ حقیقت میں وہ اقتدار پرست پختون دشمن اور منتقم مزاج خودساختہ راست باز تھے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ روس کے خلاف بین الاقوامی منصوبہ سازوں اور لوکل پارٹنرز نے اقبال کی طرح ان کی تلوار باز شاعری کو بھی پختون معاشرے میں تشدد بھڑکانے کی خاطر غیر متناسب انداز میں پروجیکٹ کی ہے۔

افغانستان میں روس کے خلاف امریکی کشمکش کی عروج کے دوران سرکاری سرپرستی میں رحمان بابا جیسے صلح کل پشتو شاعر کو نظر انداز کر کے خوشحال کو لارجر دین لائف انداز میں بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا، جس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ پختون معاشرے کی تاروپود بکھیر دی گئی بلکہ باچا خان کے عدم تشدد کے فلسفے اور تحریک کو انتہائی نقصان پہنچایا گیا۔ اس پروپیگنڈے کا کمال یہ ہے کہ باچا خان کے پیروکار آج تک خوشحال خان کو اپنی حریت فکر کا نمائندہ سمجھتے ہیں، جب کہ خوشحال خان باچا خان کے فلسفے کی سراسر ضد تھے۔

بقول پختون تاریخ دان اور دانشور ڈاکٹر سہیل خان، ایک سیمینار میں کسی نے خوشحال خان کو پختون قوم پرستی کا بانی کہا تو وہاں پر بیٹھے باچا خان نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے کہا کہ جو شخص پختونوں سے لڑتا رہا ہو وہ کیسے پختون قوم پرست ہو سکتا ہے قوم پرست تو اپنی قوم سے محبت کرتا ہے۔

ضیاء دور میں خوشحال خان کو سرکاری وسائل پر پروموٹ کیا گیا تاکہ ان کی تلوار باز شاعری کو پختونوں کی بربادی اور باچا خان کے عدم تشدد کے فلسفے کے خلاف استعمال کیا جائے۔ جب کہ اصلیت یہ ہے کہ پختون آج خوشحال خان سے جتنی عقیدت رکھتے ہیں ان کی زندگی میں ان پر اس کے عشر عشیر بھی اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھے، ورنہ وہ اپنے علاقے اور لوگوں سے دوریوں بیکسی کی موت نہ مرتے۔

مغلوں سے لڑنے کے خوشحال خان کے دو مقاصد تھے: ایک ذاتی انتقام اور دوسرا یوسفزئی کو اپنی قوم کی نظروں سے گرانا۔ یہ بالکل ویسی صورت حال تھی جب اولف کیرو نے کشمیر میں پختون گھسا کر باچا خان کو کانگریس کی نظروں میں گرانے اور ہندوستان سے ان کے تعلقات خراب کرنے کی کوشش کی تھی۔

جارج برنارڈ شا نے بائبل کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ روئے زمین پر خطرناک ترین کتاب ہے اسے تالا لگا کر رکھیں تاکہ آپ کے بچے گمراہ نہ ہوں۔ ایسی ہی صورتحال خوشحال خان خٹک کی شاعری کے بعض بیہودہ حصوں کی ہے جسے کوئی روشن خیال سے روشن خیال اور شدید قوم پرست پختون بھی اپنی بہن بیٹی اور ماں کے سامنے بیان کرنے اور وضاحت کرنے

کے لئے تیار نہیں ہو گا۔ یاد رہیں خوشحال خان نے یہ اشعار سترہویں صدی میں لکھے ہیں، جب پختون بے لچک اقدار اور نہایت روایتی انداز میں زندگی بسر کرتے تھے لیکن جو آج تک پختون معاشرے کے اخلاقی معیار پر پورے نہیں اترتے۔

امریکی اور طالبان: ایک نئی پارٹنرشپ

ایک دفعہ پھر پانچ ہزار امریکی فوجی اپنے سفارتی عملہ کو نکالنے کیلیئے واپس افغانستان آئی ہے۔ اگر امریکی فوج نے واپس ہی آنا تھا تو پھر یہ افغانستان سے گئی کیوں تھی؟ واپس آنے والے یہ امریکی فوجی دستے افغانستان سے نکلنے والے آخری دستے بھی تو ہو سکتے تھے، جو نکلتے نکلتے اپنے ساتھ اپنا سفارتی عملہ بھی بحفاظت نکال لے جاتا؟ ان سوالات کے جوابات میں افغان صورتحال کے معمے کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔

مذکورہ سوالات کا جواب دیتے ہوئے میں یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوں کہ افغانستان فتح نہیں ہوا بلکہ انتقال اقتدار کیلیئے حالات سازگار بنائے گئے با الفاظ دیگر امریکہ طالبان کو افغان حکومت میں ان کا 'جائز حصہ' دلانا چاہتا ہے۔

امریکہ کی خواہش تھی کہ وہ افغانستان میں لمبی مدت تک موجود رہے اور علاقے کے تبدیل ہوتے ہوئے معاملات میں مداخلت کا حق کسی نہ کسی طرح حاصل کرے کیونکہ افغانستان کے ہمسایہ میں ابھرتی ہوئی اقتصادی اور فوجی قوت چین ہے، جو پاکستان کے راستے، مڈل ایسٹ اور مغربی دنیا تک بلا روک ٹوک اور مختصر ترین راستہ اپنا رہا ہے، اس پر نظر رکھے تو دوسری طرف امریکہ کا پرانا حریف روس ہے، جس نے شام کی لڑائی میں امریکہ اور مغرب کے منصوبے پورے نہیں ہونے دیئے، تو ساتھ ساتھ ترکی کو ناٹو کے اتحادی ہونے کے باوجود میزائل بیچ کر تاریخی تلخیوں کے باوجود ساتھی بنانے میں کامیاب ہوتا نظر آرہا ہے۔ دوسری

طرف ایران ہے جس پر نظر اور دباؤ میں رکھنے کی سہولت اسے مہیا ہو گی۔ ساتھ پاکستان ہے جس کو چینی کیمپ میں جانے سے روکنے کیلئے امریکہ جب چاہے گا افغان حکومت، پختون الٹرا نیشنلسٹ، بلوچ علیحدگی پسندوں اور بھارت کے ذریعے دباؤ میں رکھ سکے گا۔ ان سارے مقاصد کے حصول کیلئے امریکہ کو افغانستان میں ایک پرامن اور دوستانہ سیاسی حکومتی ماحول کی ضرورت ہے جس کی خاطر اس نے اربوں ڈالر کے علاوہ اپنا خون پسینہ بہایا لیکن طالبان کی مخالفت کی وجہ سے مذکورہ مقاصد حاصل نہیں کرسکا، تو طالبان کو ساتھ ملا کر ان مقاصد کے حصول کیلئے نیا راستہ اختیار کیا۔

آج سے دس پندرہ سال پہلے جب بھی طالبان نے افغان حکومت یا امریکہ سے براہِ راست بات چیت کرنے کی کوشش کی، مخالف قوتوں نے کسی نہ کسی طرح اسے ناکام بنایا۔ آخر کار امریکی خواہش پر، پاکستان، طالبان مذاکرات کاروں کو، دوحہ میں امریکی حکومت کے ساتھ بٹھانے میں کامیاب ہوا۔ مذاکرات کے کئی دور ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ اچھے تعلقات کار استوار کئے گئے، ایک دوسرے کو ضمانتیں سہولتیں اور آگے بڑھنے کے مواقع دیئے گئے، جس کے نتیجے میں، اشرف غنی حکومت کی ناراضگی کے باوجود، ایک معاہدہ طے پا گیا، جس کے تحت امریکی فوج کا انخلا ممکن ہو سکا۔ اگرچہ اس انخلاء کی شرائط کے بدلے میں ظہور پذیر ہونے والی صورتحال میں سب سے بڑی رکاوٹ امریکہ کی سرپرستی میں بنائی گئی موجودہ افغان حکومت ہے، دوحہ مذاکرات میں طالبان نے امریکیوں کو کیا دیا؟ وہ ابھی ہزار پردوں میں مستور ہے، لیکن امریکیوں نے یقیناً طالبان کو اشرف غنی کی حکومت چلی جانے کی ضمانت دی ہے، جس کے نابود اور مختصر ہوتے ہوئے اقتدار پر ابھی تک کچھ حلقوں کو یقین نہیں آتا۔

امریکہ اور طالبان کے درمیان دوحہ معاہدے کی بہت ساری شقیں، لگتا ہے، ایسی ہیں، جس کی علاقائی صورتحال پر دور رس اثرات مرتب ہونگے، جن کو معاہدے کے منسلکات (انیکشرز) کہہ کر مدتوں سامنے نہیں لایا جائے گا۔

مذاکرات کے نتیجے میں ایک دوسرے کیلئے ساز گار ماحول بنانے کیلئے نیک نیتی پر مبنی

ایسے اقدامات کیئے گئے جس سے طرفین کو مختلف سہولیات حاصل ہوئیں۔ ان اقدامات میں پہلا قدم امریکی فوج کے ایک حصے کا افغانستان سے واپسی تھی، جو امریکہ نے حسبِ ضرورت کر دکھایا۔ یوں ایک طرف امریکہ کی نیک نیتی ثابت کی تو دوسری طرف طالبان نے اپنے ساتھیوں اور دوستوں کے سامنے خود کو فاتح ظاہر کر کے معاہدے میں آگے بڑھنے کا حوصلہ پایا۔ مذکورہ معاہدے کی ایک شق کے طالبان کو افغانستان میں موجود ایسی اسلامی شدت پسند تنظیموں کے خلاف جنگی کارروائی کی پابند کرتی ہے جو مغرب اور امریکہ کے مفادات کے خلاف سرگرم ہوں، بالفاظ دیگر ایسی اسلامی شدت پسند تنظیموں کے خلاف طالبان امریکی لاجسٹک اور انٹیلیجنس سپورٹ کے ساتھ کاروائی کرنے کی پابند ہوئی جن کا ایجنڈ اعلاقائی ہونے کی بجائے بین الاقوامی ہو۔ طالبان نے ابھی تک اکا دکا جھڑپوں کے علاوہ ایسا کچھ کیا ہو بظاہر نظر تو نہیں آرہا لیکن امریکہ نے اپنے انٹیلیجنس ذرائع سے طالبان کی کوششوں سے ضرور آگاہی اور اطمینان حاصل کیا ہو گا۔

معاہدہ کے ایک جز کے مطابق امریکہ طالبان پر ایک مقررہ مدت تک نظر رکھتا، جس کے نتیجے میں مطمئن ہو کر امریکہ آگے کے اقدامات کرتا، نگرانی کے اس دورانیے کے دوران امریکہ کو جب محسوس ہوا کہ طالبان امریکہ کی مرضی کے مطابق عمل پیرا نہیں ہیں تو ان پر بمباریاں کی گئیں، اور ساتھ ساتھ افغان حکومت کو مالی اور فوجی امداد کے علاوہ اشرف غنی کے حق میں سرکاری بیانات دیئے گئے، جس سے تاثر ملتا رہا گویا امریکیوں نے اشرف غنی حکومت کو چھوڑا نہیں، جبکہ در حقیقت اس دوران طالبان کو راہ راست پر لایا جارہا تھا۔ امریکہ کی طالبان پر ایک دن بمباری دوسرے دن اشرف غنی حکومت کی امداد اور ساتھ دینے کے اعلانات، اور پھر تیسرے دن یہ کہنا کہ افغان حکومت خود لڑے، ہم ساتھ نہیں دے سکتے، کی صورتحال کو، باہر کی دنیا نے امریکی پالیسیوں کا کنفیوژن سمجھا، لیکن در حقیقت وہ اس دوران اپنے مقاصد کے حصول کیلئے طالبان کے ساتھ کیرٹ اینڈ سٹک کا کھیل رہا تھا۔

جونہی اس معاہدہ کے جزیات اور اس کے منسلکات پر فریقین کا سمجھوتا ہو گیا، اشرف غنی کی حکومت، دوپہر کے وقت، جون کے مہینے میں، ملتان کی سڑک پر، کسی بچے کے

ہاتھ سے گرے ہوئے آئس کریم کی طرح ناقابل یقین حد تک مختصر وقت میں پگھلتے پگھلتے غائب ہونے لگی۔

طالبان کو امریکیوں کے ساتھ بٹھانے میں پاکستان نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا، جس کے بدلے میں امریکی کشمیر کے مسئلے پر پاکستان کو انڈیا سے سہولیات دلانے کا وعدہ کر چکے تھے، جس کے بارے میں وزیراعظم صاحب نے ورلڈ کپ سے بڑے ورلڈ کی خوشخبری قوم کو امریکہ سے واپسی پر سنائی تھی، لیکن دوسری سرد جنگ میں امریکی کیمپ میں شمولیت اختیار نہ کرنے کی وجہ سے امریکہ نے نہ صرف پاکستان سے سرد مہری کا رویہ اختیار کیا بلکہ طالبان کا دفتر دوحہ میں قائم کر کے پاکستان کے اثرات کو ان پر مزید کم کر دیا اور یوں پاکستان ایک بنیادی کھلاڑی کی بجائے بارہویں کھلاڑی کی طرح باہر بٹھا دیا گیا۔ اس لئے اب پاکستانی حکومت کو امریکہ سے یہ شکوہ ہے کہ طالبان آپ کے ساتھ مذاکرات کی میز پر بٹھانے کے باوجود آپ اپنی کوتاہیوں کا ملبہ ہم پر گرا رہے ہیں۔

چونکہ پاکستان کی موجودگی میں امریکہ طالبان کے ساتھ اپنے مفادات کیلئے آزادانہ اور مرضی کا معاہدہ نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ پاکستان اور امریکہ کے مستقبل کے ترجیحات اور مفادات ایک دوسرے سے متصادم تھے۔ امریکہ چین کو مستقبل کا مخالف جبکہ پاکستان اسے اپنا مستقل دوست سمجھتا ہے، اس لئے پاکستان شکوہ کناں ہے کہ ہمارے ذرائع سے طالبان کو رام کرا کر امریکہ نے ہمیں مستقبل کے مذاکرات اور ان کے فوائد سے مکمل طور پر الگ کر دیا۔

اس دوران طالبان نے افغانستان کچھ علاقے قبضہ کئے اور ساتھ ساتھ ہمسایہ ممالک کے ساتھ بات چیت کر کے انکے خدشات دور کرنے کی کوشش کی۔ اشرف غنی حکومت طالبان کے ساتھ کسی بھی قسم کے مذاکرات میں حصہ لے رہی تھی نہ امریکی معاہدے کے مطابق طالبان قیدیوں کو چھوڑ رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ طالبان کے ساتھ مذاکرات اس کی قیمت پر ہو رہے ہیں اس لئے اسے پارٹ آف دی سلوشن ماننے کی بجائے پارٹ آف دی پرابلم مانا گیا یعنی وہ حل کا حصہ بننے کی بجائے مسئلے کا حصہ بنی رہی۔ (یہ بھی ممکن ہے کہ

اشرف غنی دوحا معاہدے کی مخالفت امریکی سٹریٹیجی کے تحت کر رہا ہو تاکہ جتنا سں ممکن ہو امریکی سہولیات حاصل کر سکے)۔

افغان حکومت کی تحلیل ہوتی ہوئی اتھارٹی سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اب طالبان اور امریکیوں کے درمیان ایک قابلِ عمل معاہدہ مکمل ہو چکا ہے، جس کی وجہ سے امریکی فوج طالبان کی مرضی سے واپس افغانستان آگئی ہے، جو اپنا عملہ نکال کر غنی حکومت کو احساس دلا رہی ہے کہ اب تم تنہا ہو، بہتر ہو گا دوحہ معاہدہ مان لو، جس کا مطلب ہے استعفیٰ دے کر ایک قابلِ قبول عبوری حکومت کیلئے راستہ ہموار کر دو، جس کی مخالفت کی صورت میں اغلب امکان ہے کہ وہ کسی رات آرگ (صدارتی محل) میں تنہا اپنی زندگی کی لڑائی کیلئے مجبور ہو کر سب کچھ ہار جائے گا۔

دوسری طرف سے کابل طالبان کے مکمل محاصرے میں ہے۔ سارے ملک اور خصوصاً کابل اور جلال آباد کو آمد و رفت اور ہر قسم کی سپلائی طالبان کی مرضی سے ممکن اور مشروط ہے۔ ایسی حالت میں غنی حکومت کے پاس مذاکرات اور اس کے نتیجے میں حکومت چھوڑنے کے علاوہ کوئی آپشن نہیں بچی۔ کیونکہ اس طرح وہ افغان فوج اور ریاستی مشینری تباہ ہونے سے بچا سکتا ہے، جس پر امریکہ نے اربوں ڈالر کا خرچہ کیا ہے۔ اشرف غنی کی خواہش ہو گی کہ اسے مستقبل میں استعمال کرنے کیلئے محفوظ رکھا جائے۔ اشرف غنی کی حوصلہ افزاء تقاریر سن کر مجھے صدام حسین یاد آتا ہے جو آخری وقت تک سرپرائز دینے کی باتیں کرتا تھا لیکن اس کی سرپرائز آخر میں واقعی سب کیلئے سرپرائز تھی۔ کچھ لوگ اب بھی یہ شہادت دینے کیلئے موجود ہیں کہ جب اس نے آخری تقریر میں سرپرائز دینے کی بات کی تھی تو میرا تجزیہ تھا کہ یہ جلد بھاگ جائے گا، یہی اس کی سرپرائز ہے۔ اشرف غنی کی حکومت اس وقت عبوری حکومت کی تشکیل پر مذاکرات میں مصروف ہے۔ اس لئے میں نے ابتداء میں لکھا کہ افغانستان میں کسی کا قبضہ ہوا ہے نہ فتح بلکہ ایک سیاسی بندوبست کے تحت انتقال اقتدار کا عمل وقوع پذیر ہو رہا ہے جو خوش آئند ہے۔

اکثریتی افغان لوگ ذہنی طور پر طالبان کے بہت قریب ہیں۔ ان جیسا فیشن، ان

جیسی متشدد سوچ، خود کو صحیح اور راستباز اور دوسرے فرقے کو مشکوک سمجھنا، عورتوں اور اقلیتوں کو جینے کا محدود حق، مخالف کو گردن زدنی سمجھنا اور طاقت اور طاقتور کا ساتھی بننا ایسی بری خصوصیات ہیں، جن کی وجہ سے وہ جمہوریت اور جمہوری قدروں تک پہنچتے پہنچتے بہت سے کوہ سفید پیدل طے کریں گے تو کہیں جا کر پہنچیں گے۔

اس وقت سب کی توجہ، امن اور مصیبت میں مبتلا افغان عوام پر مرکوز ہونی چاہیئے، جو تیزی سے چھا جانے والے وسط ایشیا کے سرد ہوتے ہوئے موسم کی شدتوں کی زد میں ہیں۔ اگر موسمی حالات کے تبدیل ہونے تک افغان حکومت کا فیصلہ نہ ہو سکا تو افغانستان میں ایک بڑا افسوسناک انسانی المیہ وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔

مولوی، خواجہ سرا اور گل خان

خواجہ سرا اللہ کی تخلیق ہے جبکہ مولوی مدرسوں میں بنتے ہیں۔ مولوی کے ساتھ ساتھ خواجہ سرا ہر اس شخص سے ڈرتا ہے جس سے اسے ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ تھوڑا سا فرشتہ، چٹکی بھر شیطان، تھوڑا سا مرد، تھوڑی سی عورت، ڈھیر ساری نسوانیت اور بہت سارا نخرہ اور دنیا بھر کی تنہائیاں ملا کر خالق نے مرد عورت فرشتہ اور شیطان سے الگ اور منفرد مخلوق بنائی تو ہمارے لئے اسے سمجھنے کا مسئلہ پیدا ہوا کہ ہم اسے کیا نام اور کون سا مقام دے دیں، عورتیں جنہیں دیکھ کر بدکتی ہیں اور مرد جنہیں پا کر کنفیوز ہوتے ہیں جبکہ مولوی اسے اپنے محدود علم اور فتویٰ پرور طبعیت کی بنا پر گردن زدنی سمجھتے ہیں جس کے ان کی کم علمی کے علاوہ معاشی وجوہات بھی موجود ہیں۔ یوں مدت ہوئی پختونخوا میں، مولوی کی وجہ سے، خواجہ سرا اور پختون دونوں، امن کی بھیک مانگتے پھر رہے ہیں۔ جس طرح خواجہ سرا کبھی بادشاہوں کے مشیر، رازدار اور حرم کے محافظ ہوا کرتے تھے اسی طرح پختون بھی کبھی ہندوستان کے بادشاہ تھے جو جنگجو اور خوفزدہ کر دینے والے کہلائے جاتے تھے۔ ان کے نام لے کر مائیں شریر بچے ڈرایا کرتی تھیں، لیکن اب وہی پختون بلوچستان سے لے کر وزیرستان، اورکزئی، کرم، خیبر، مہمند، باجوڑ، سوات اور مالاکنڈ میں نامعلوم ہیولوں سے سہمے ہوئے امن کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ کبھی کبھی خواجہ سرا کا قاتل پکڑا بھی جاتا ہے اور سزا بھی ہو جاتی ہے لیکن پختونوں کا قاتل پکڑا جاتا ہے تو سزا نہیں ملتی اور سزا کی امید ہو تو پکڑا نہیں جاتا۔

دوغلے قوم پرست مسلم لیگیوں نے تقسیم کے وقت پنجابیوں کو پنجابی سے کٹوایا، لیکن اس جذباتی چرکے سے اس کے اندر پیدا ہونے والی طیش کو ہندوستان کے خلاف کشمیر میں استعمال کرنے کی بجائے، گل خان کو مجاہد سمجھا کر وہاں بھیجا گیا، جس کو ویسے بھی دوسروں کو اپنی ایمانداری، بہادری اور سیاسی شعور ثابت کرنے کی شدید خواہش رہتی ہے۔ کوئی کہہ دے کہ گل خان بڑا بہادر ہے تو وہ اپنی تعریف پر اکتفا کرنے کی بجائے قریبی پہاڑ پر چڑھ کر وہاں سے چھلانگ لگا کر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اسے اپنی جان بچوں اور والدین کی کوئی پرواہ نہیں بس اس نے تعریف کرنے والے کو سچا ثابت کرنا ہے۔ یہی حالت گل خان کے ایمان کی ہے۔ کوئی کہہ دے کہ گل خان بڑا ایماندار ہے تو وہ بولنے والے کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے گھر جا کر وہاں سے بستر اٹھالیتا ہے اور اپنے ایمان کی برکات سے شرق و غرب کو منور کرنے برسوں بے فکر ہو کر اپنا گھر اور روزگار چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح جب اس کے سیاسی شعور کا بھی یہ کہہ کر اعتراف کیا جائے کہ وہ کسی حکومت کو دوبارہ ووٹ نہیں دیتا، تو اپنے اچھے خاصے مفید امیدوار اور سیاسی پارٹی کو دوبارہ ووٹ نہ دے کر اپنے معترف کو ہزار تکلیفیں اٹھا کر سچا ثابت کر دیتا ہے۔ مشہور پختون دانشور، مجی رشید یوسفزئی گل خان کو مفت کا خواجہ سرا کہتا ہے، جو پرائے جلوسوں اور جلسوں میں فری ناچتا اور لڑائیوں میں فری مرتا ہے۔

خواجہ سرا کی اصل زندگی اس کے چاہنے والے تماشبینوں کے درمیان ہوتی ہے، ورنہ وہ تنہا رہتا اور اکیلے مرتا ہے۔ مولوی کو اچھا خواجہ سرا وہ لگتا ہے جو مرا ہوا ہے اور جس کا جنازہ پڑھانے کا محنتانہ وہ ایڈوانس میں یکمشت وصول کر چکا ہوتا ہے۔ ایسے جنازے مسافر اور لاوارث بتا کر مولوی مغرب کے وقت مسجد کے قریب پڑھاتا ہے۔ ایسا ہی ایک جنازہ پڑھنے کے بعد چار لوگوں نے اٹھایا ہوا تھا کہ چار گل خانوں کی اس پر نظر پڑ گئی۔ دینی حمیت کے مارے چاروں نے جنازے کو کاندھا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد باقی لوگ اندھیرے میں آہستہ آہستہ غائب ہو گئے اور جنازہ گل خانوں کے کاندھوں پر رہ گیا۔ وہ حیران تھے کہ مردہ کون ہے؟ اس کے رشتہ دار اور قبرستان کہاں ہے؟ اور وہ اس کا کیا کریں کیونکہ وہ تو یہ بھی

نہیں جانتے تھے کہ مردے کو دفن کہاں کرنا ہے؟

ان کنفیوز گل خانوں کی طرح ہمارے گل خانوں کو بھی معلوم نہیں کہ چالیس سالوں سے جہاد کا جنازہ کاندھے پر رکھے ہوئے وہ اب کیا کریں؟ عرب یورپین اور امریکی تو کب کے کھسک چکے ہیں۔ پیسے کھانے اور کمانے والے مولوی بنگلوں میں رہتے بڑی جیپوں میں پھرتے مدرسوں اور جائیدادوں کے مالک اب مقدس علماء کرام کہلائے جاتے ہیں۔ ان کے ہینڈلر بھی ڈالروں کے چشمے خشک ہوتے ہی اپنے بجھے ہوئے سگار دوبارہ سلگا کر جنوبی ایشیا کے ماہرین بن کر مغربی تھنک ٹینکوں میں پالیسی پیپرز لکھنے میں مصروف ہیں۔ لیکن گل خان مرے ہوئے خواجہ سرا کی بے آسرا لاش کاندھے پر ڈال کر کچھ پانے کی امید لگائے بیٹھا ہے۔ خواجہ سرا کی کمائی اس کی جوانی میں ہوتی ہے بڑھاپے میں وہ بوجھ ہوتا ہے لیکن گل خان اب بھی مولوی کی باتوں میں آکر اس کی لاوارث لاش سے کوئی فائدہ ملنے کی توقع کر رہا ہے۔ باچا خان کی نصیحت چھوڑ کر اور مولوی کی مان کر وہ جو نقصان اٹھا چکے ہیں ان میں کچھ کو اب منظور پشتون کی بات میں وزن محسوس ہو رہا ہے اس لیے جنگ پسند گل خان اب جنگ گریز مظاہروں میں نظر آنے لگا ہے۔

کابل کے ہوٹل میں چائے کا کپ پینے والی پالیسی اب ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے۔ مسعود اظہر کا روپوشی سے انکار ہو یا بارڈر اور کرکٹ میچ کی وجہ سے بظاہر ظہور پذیر ہونے والی وقتی ٹینشن، حالات ویسے نہیں جیسے ہم نے سوچا تھا۔ پاکستان جیسے نظریاتی ملک کو ہر قیمت پر ایک دشمن چاہیے ہوتا ہے۔ اسرائیل کی طرح پاکستانی بھی ہمہ وقت دشمن کی خوف کی وجہ سے یکجہتی کا اظہار کرتا ہوا دکھائی دیتے ہیں۔ دو قومی نظریہ اب مزید ہندوستانی بارڈر پر وارا نہیں کھاتا، اس لیے اسے مشرقی بارڈر سے مغربی بارڈر پر منتقل کیا جا رہا ہے۔ جس کی ابتدا چند سال پہلے انگلینڈ میں کرکٹ سٹیڈیم کے باہر مبینہ افغان تماشائی کا پاکستانی جھنڈے کی توہین سے ہوا ہے اور اب شارجہ میں کرکٹ ٹورنامنٹ کے دوران تماشبینوں اور کھلاڑیوں کے درمیان بنتی بگڑتی صورتحال سے مزید صیقل کر کے مستقبل میں مناسب موقع پر بھڑکایا جائے گا۔ اس لیے وزیر داخلہ نے کرکٹ ٹورنامنٹ سے چند دن پہلے ایک پریس کانفرنس

کے دوران عمران خان کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ عمران ہی کی طرح کی باتیں تو دشمن ملک افغانستان بھی پاکستان کے خلاف نہیں کرتا۔ جس کی نشاندہی پر بعد میں اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ مجھ سے غلطی ہوئی میں بھارت کہنا چاہ رہا تھا۔ جبکہ جس پرسکون انداز میں افغانستان کو دشمن کہہ کر اس نے ذکر کیا تھا اس میں بھارت کا کہیں ذکر تک نہیں تھا۔ یہ سرکاری طریقہ کار ہوتا ہے، پہلے فیلر چھوڑتے ہیں، ردعمل شدید آئے تو پھر وضاحت یا تردید کی جاتی ہے۔

حالات کو پیش نظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ افغانستان جلد پاکستان کا دشمن نمبر ون بنے گا۔ وہاں پر موجود حکومت اسی طرح ڈسٹ بن میں پھینکی جائے گی جس طرح ان کی پہلی حکومت پھینکی گئی تھی۔ امریکہ ایمن الظواہری کی لاش کے ثبوت کی شکل میں طالبان پر دوحا معاہدے کی خلاف ورزی کے الزامات لگا رہا ہے۔ طالبان معاہدے کے اگلے مرحلے میں روس اور چین کے خلاف حسب منصوبہ عمل نہیں کریں گے تو وہ دن دور نہیں جب ڈرونز کے ساتھ بی باون بھی آسمان سے موت برسائیں گے۔ یورپ کو یوکرین میں روس کی اور امریکہ کو تائیوان میں چین کی توجہ بٹانے کے لئے طالبان کی ضرورت ہے۔ طالبان مغربی منصوبہ میں حصہ دار بنتے ہیں اور پاکستان ساتھ دیتا ہے تو پاکستان کے چین کے ساتھ تعلقات کمرہ امتحان میں مہمان بنتے ہیں اور پاکستان ساتھ نہیں دیتا تو پھر ہمارے لیے تپش مزید شدید ہو جائے گی۔

اب پاکستان کے منصوبہ سازوں کا امتحان ہے، طالبان بنا کر جو وقت لیا گیا تھا وہ ختم ہونے والا ہے۔ جس کا خزانہ جیبیں اور پھیلے ہوئے ہاتھ خالی ہیں۔ کوتاہ بین فوجی آپریشن کا مزہ چکھ کر عوام نے سبق سیکھ لیا ہے وہ بندوق برداروں کو اور نہ جنگ کو، مزید برداشت کرنے کے روادار ہیں۔ لیکن اصل مسئلہ گل خان اور خواجہ سرا کا ہے جو اپنی سرزمین پر سہمے ہوئے بیٹھے ہیں جو امن یا شاید امان چاہتے ہیں۔

داداجی کی قربانی اور باباجی کے کھوٹے سکے

جو لوگ اپنی قربانیوں کا گاہے بگاہے ذکر کرتے ہیں وہ دراصل اس کا معاوضہ مانگتے ہیں۔ اس ملک میں شروع سے کچھ لوگ زیادہ پاکستانی کچھ کم، کچھ خالص محب وطن کچھ خالص غدار، کچھ سمندر میں پھینکنے لائق کچھ دریائے سندھ میں، کچھ تربیلا ڈیم میں، کچھ انڈیا میں دھکیلنے اور کچھ افغانستان میں بھیجنے کے قابل ہیں، جبکہ قربانیاں دینے والے سیاسی متقی ایسے لایعنی دعوے کرتے ہوئے بھول جاتے ہیں کہ پاکستان برصغیر کے تمام مسلمانوں کے لئے بنایا گیا تھا چند 'محب وطن' پاکستانیوں کے لئے نہیں۔ حب الوطنی بھی عجیب دعویٰ ہے کچھ لوگ سمجھتے ہیں جب تک آپ اس کی تنخواہ نہیں لیتے آپ کو ایسا دعویٰ کرنے کا حق ہی نہیں۔

آپ سب سیاسی متقیوں کا شکریہ کہ آپ میں سے کسی کی دادی نے آلو پالک کی قیمتی چڑھی ہوئی ہانڈی اسی طرح چھوڑ دی، کسی نے کھڑے کھڑے قرار داد پاکستان کی منظوری میں چپ چاپ حصہ لیا اور کسی کے دادا نے جیل کاٹی اور ہم نکموں کے لئے پاکستان بنایا۔ لیکن آپ کے اس پاکستان میں ہمارے لئے عالمی قرضوں، مہنگائی، بیروزگاری، بدامنی، ناانصافی اور نارسائی کے سوا ہے کیا؟ انصاف تو تحریک انصاف کے دور میں بھی ناپید ہے، فیئر پلے کا موقع کپتان بھی نہ دلا سکا۔ غربت مہنگائی اور بیروزگاری سے روٹی کپڑا مکان والے بھی نجات نہ دلا سکے۔ موٹر ویز ڈیم ائرپورٹ تو بنے لیکن ایک چھوٹے سے پٹواری سے اپنی زمین کے انتقال کی فرد علی محمد خان صاحب کے دادا کے جیل فیلو جناح صاحب کے درشن کرائے بغیر

ملتی ہے نہ ریپ شدہ بچی کے ساتھ گئے ہوئے مظلوم باپ کی عزت نفس تھانے میں سالم رہتی ہے۔

جتنے پشتون وزیر علی محمد خان صاحب نے گنواتے ہیں اگر یہ سارے واقعی مسلم لیگ بنانے والے خاندانوں سے ہیں تو پھر خان قیوم جیسے سابقہ کانگریسی ابن الوقت اور اقتدار پرست کو مسلم لیگ نے وزیر اعلیٰ کیوں بنانا تھا؟ آپ لوگوں نے پاکستان بنایاہے ہم مانتے ہیں تبھی تو آپ کے خاندان میں وزارتیں بٹ رہی ہیں، بیشک آپ کے والد صاحب 'مستند غدار' باچا خان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت عظمیٰ میں وزیر کیوں نہ بنے ہوں؟ آپکو یقین ہو یا نہ ہو پاکستان ہمارا ہے۔ اس کے ایک ایک مرلے کا ہم بائیس کروڑ پاکستانیوں کے نام انتقال ہو چکا ہے اور وہ دن دور نہیں جب خلق خدا تنگ ہو کر اٹھے گی اور اس ملک کو اشرافیہ کی چنگل چھڑا کر آئینی اور قانونی جمہوریہ بنائے گی۔ آپ لوگوں کے پاس ڈبل نیشنلٹی ٹرپل روزگار لامحدود دولت اکٹھا کرنے کے ذرائع ہیں، ملک خدانخواستہ ڈوبا تو آپ سب سے پہلے لائف جیکٹ اور لائف بوٹ لے کر نکلیں گے اور ہم عرشے پر کھڑے آرکسٹرا کی طرح ماتمی دھنیں بجاتے ہوئے اس کے ساتھ ڈوبیں گے، یہ ہمارا آخری ٹھکانہ ہے کیونکہ آپ لوگوں کی کماؤ پالیسیوں کی وجہ سے ہمیں نہ کوئی ویزہ دیتا ہے نہ پناہ دینے کا روادار ہے۔

رہی بات جیلیں کاٹنے کی، تو اس کی بابائے قوم کی نظر میں ذرہ وقعت نہیں تھی۔ تحریک پاکستان کے دوران اخبار والے نے ان سے پوچھا کہ گاندھی نہرو پٹیل آزاد باچا خان جیل جاتے ہیں تو آپ کو انگریز جیل کیوں نہیں بھیجتا؟ بابائے قوم نے اخبار والے کو جواب دیا کہ میں کوئی کریمنل ہوں کہ جیل جاؤں؟ جیل جانے والے ان کی نظر میں کریمنل تھے۔ آج کی جس مسلم لیگ کو آپ برا کہتے ہیں اس میں تو اٹھ کر کھڑے ہونے اور بولنے والے ابھی پیدا ہونے شروع ہوئے ہیں ورنہ مسلمانوں کے دل میں انگریز کے لئے وفاداری اور محبت کے جذبات پیدا کرنا جس پارٹی کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد ہو اس پارٹی کے خان نواب جاگیردار جیل جاتے یا سر پر رکھی خان بہادری رائے بہادری نواب زادہ اور 'سر' کے خطاب سنبھالتے۔ بانی پاکستان نے کانگریس، جماعت اسلامی، جمعیت علمائے ہند، احرار یا

خدائی خدمت گار تحریک کے کارکنوں کے بارے میں نہیں کہا، اپنی مسلم لیگ کے بارے میں کہا کہ میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں، نیز پاکستان میرے ٹائپ رائٹر اور میں نے بنایا ہے۔

ہاں آپ کی موجودہ پارٹی اور اس وقت کی مسلم لیگ میں مماثلتیں موجود ہیں۔ جس طرح آپ کے پاس حکومت ملنے کے بعد کوئی لائحہ عمل نہیں اور ہر سوال مسئلے اور مطالبے کے حل کے جواب میں ریاست مدینہ کے پیچھے چھپتے ہیں، ٹھیک اس وقت بھی کوئی پوچھتا کہ پاکستان بنانے کے بعد وہاں کون سا نظام رائج کیا جائے گا تو جواب ملتا اس کا فیصلہ تو چودہ سو سال پہلے ہو چکا ہے۔ لیکن جب ملک الگ ہوا تو معلوم ہوا کہ آئین بنانے کے بارے میں بھی کبھی سوچا نہیں گیا تھا۔ جس کی وجہ سے مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان 1935 کے ایکٹ کے تحت چلائی جانے لگی، جس نے ملک کو ستائیس سال سیاسی نوسر بازوں اور طالع آزماؤں کا تختہ مشق بنا کر آخر کار دولخت کر دیا۔ اگر مسلم لیگ واقعی کوئی سیاسی جماعت تھی تو بابائے قوم آخری دنوں میں زیارت میں کیوں تھے؟ سہروردی، اے کے فضل حق اور شیخ مجیب الرحمٰن کیوں غدار ٹھہرائے گئے؟ وہ تو سیاسی متقیوں کی جماعت کے سرخیل تھے

جب آپ خود ناکام ہو جاتے ہیں تو پھر باپ دادا کے کارناموں کے پیچھے چھپتے ہیں۔ اگر پاکستان واقعی آپ کے باپ دادا نے بنایا ہے تو پھر جناح صاحب کے اسی پرانے پاکستان میں کیا خرابی ہے؟ جو آپ عمران خان کے ساتھ مل کر اسے منہدم کرنے اور نیا پاکستان بنانے نکلے ہیں۔ اپنے باپ دادا کی طرح آپ کو بھی حق ہے کہ ہم پر حکومت کریں، شہباز گل کو بھی حق ہے کہ آلو پالک کی چھوڑی گئی ہانڈی کے بدلے اور چرب زبانی کے صدقے وزارتوں کے مزے اڑائیں، مراد سعید کی مرادیں بھی اللہ پوری کریں اور شہریار آفریدی کے خاندانی قربانیوں کے بدلے اللہ تعالیٰ انہیں بھی مزید ترقی دے۔ ہمیں نیا پاکستان، چینی، گھی، بجلی، آٹے، دال، پٹرول اور دوائیوں کے روزمرہ کے حساب سے نئے نرخ اور ایمانداری سے ہونے والی حکومت کی بجائے جناح صاحب کا وہی پرانا پاکستان لوٹا دے جس کی خاطر آپ کے دادا جی نے جیل کاٹی، عمران خان کے والد نے قرارداد پاکستان

میں خاموش کھڑے ہو کر شرکت کی اور شہباز گل کی دادی نے پکنے والی پالک کی ساگ چڑھی ہوئی ہانڈی چھوڑی تھی۔

پاکستان کو پنجابیوں سے خطرہ ہے

اسلام کے نام پر بنائے گئے پاکستان میں اسلام اور پاکستان دونوں ہمیشہ خطرے میں بتائے جاتے ہیں۔ ایک طرف ہمیں ہنود و یہود تو دوسری طرف ہمسایوں سے خطرہ ہوتا ہے۔ مولوی کے نزدیک اسلام کو پاکستانیوں سے خطرہ ہے، جس کی وجہ سے ہر نوع کی توہین میں پکڑے گئے ملزمان سے جیلیں بھری پڑی ہیں۔ اسلام کے مختلف جہتوں کی تحفظ کی خاطر بنی ہوئی مسلکی اور فرقہ وارانہ پارٹیاں اور تنظیمیں موجود ہیں۔ ملک کو ہنود و یہود کی خطرات سے بچانے کے لئے بڑی فوج ہے تو اسلام کو ہر وقت لاحق خطرات سے بچانے کے لئے ایک سیاسی امہ موجود ہے۔ پاکستانیوں کو کیا خطرات ہیں؟ ان کی سروائیول کے لئے کیا ضروری ہے؟ ملک چلانے والوں کو احساس ہے نہ پاکستانیوں کو یہ سوچنے کی اجازت ہے۔

بابائے قوم کے مطابق پاکستان اسلام کی لیبارٹری ہے، لیکن میرے خیال میں مقتدرہ اس لیبارٹری کی سائنسدان اور پاکستانی شہری اس لیبارٹری کے گنی پگز ہیں۔

یوں تو مقتدرہ ہمیں ازلی تصوراتی دشمنوں سے ڈراتی رہتی ہے لیکن ان کی نظر میں اس ملک کو اصل خطرہ ہم سے ہے۔ پنجابی چونکہ اس ملک کی غالب اکثریت ہیں اس لئے وہ سندھیوں بلوچوں اور پختونوں کے ساتھ ساتھ پنجابیوں کو بھی ملک کے لئے خطرہ سمجھتی ہے۔ جس کی تدارک کے لئے پہلے آئین نہیں بننے دیا گیا اور بعد میں اس آئین کو چلنے نہیں دیا گیا بلکہ اپنی آسانی اور بہتر منیجمنٹ کی خاطر آدھی آبادی خلیج بنگال میں پھینک دی گئی۔

آئین پنجابیوں سندھیوں بلوچوں اور پختونوں کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی زبانوں ثقافتوں اور حقوق کی ضمانت دیتا ہے، اس لئے غیر آئینی حکومتیں مسلط کرکے ان اقوام کی موجودگی کی نفی کرتے ہوئے ایسی قانون سازیاں کی گئیں، سوڈو سیاست دان اور دائمی عہدیدار تخلیق کیے گئے کہ جب وہ غیر آئینی حکومتیں ختم بھی ہو جائیں تو ان ادوار مین تیار کردہ قوانین سیاستدانوں اور عہدیداروں کے ذریعے ان غیر قانونی حکومتوں کے اثرات مٹائے نہ جاسکے۔ یہی قوتیں سیاست کو گالی اور سیاستدانوں کو چورڈاکو مشہور کراکر ملک دشمن مشہور کراتی ہیں اور یوں قومی سیاسی رہنما ابھرنے نہیں دیتیں تاکہ پنجابی سندھی بلوچ اور پختون کسی ایک سیاسی شخصیت کے پیچھے اکٹھے ہو کر ان کی متبادل طاقت نہ بن جائے۔ لیکن دوسری طرف تعلیمی نصاب اور مسلکی مینیپولیٹرز کے ذریعے یہی قوتیں پنجابیوں سندھیوں بلوچوں اور پختونوں کو ایک نئ قوم بنانے میں لگی ہوئی ہیں، جو تب بن سکتی ہے کہ اگر بلوچ پختون پنجابی اور سندھی اپنی زبانیں ثقافتیں روایات ہیروز اساطیری کردار اور صدیوں کا تسلسل یکسر مٹادیں اور زومبی بن کر یہ جو کہتی ہیں، ویسا کریں، یہ جو کہتی ہیں ویسا رویہ اپنائیں۔

اگست 1947 سے پہلے بھی ہم پنجابی پختون سندھی بلوچ اور مسلمان تھے اور یہی آج بھی ہیں۔ 13 اگست تک ہم ہندوستان کی بادشاہتوں محلات یادگاروں مقبروں باغات اور قلعوں کے وارث تھے، انگریز سمیت کسی نے ہم پر شک و شبہ نہیں کیا تھا۔ ہماری زبان ثقافت اور روایات سے ہندوستان یا اس کے حکمرانوں کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لیکن نیا ملک بننے کے بعد اچانک پنجابیت سندھیت بلوچیت اور پختون ولی سے اس ملک کو خطرات لاحق ہو گئے، جس کی وجہ سے ہماری شناختیں مٹائی جارہی ہیں۔ تعلیمی نصاب میں پندرہ سال تک انگریز کے خلاف لڑنے والے عمرا خان جندولی کا ذکر نہیں لیکن میسور کے نواب کا ذکر ہے۔ انگریز کے خلاف بے بہا بہادری دکھا کر شہادت پانے والے رائے احمد خان کھرل کی کہانی نہیں لیکن بنگال کے سراج الدولہ کی ہے۔ آزاد سکول کے نام سے سینکڑوں تعلیمی ادارے بنانے اور اس کی خاطر جیل کاٹنے والے باچا خان کی تاریخ نہیں لیکن ہندوستان میں ایک کالج بنانے والے کی ہے۔ بلھے شاہ اور شاہ حسین رحمان بابا کی شاعری کسی نصاب میں شامل نہیں لیکن ولی

دکنی کی ہے۔

عمران خان کی حکومت ایک سنگل انتظام نہیں، ہمہ جہت انتظامات کا ایک مکمل پیکج تھا، جسے باجوہ ڈاکٹرائن کا نام دیا گیا تھا۔ باجوہ بذات خود مختصر مدت کے ایک سرکاری عہدیدار کا نام ہے جبکہ جمہوری ممالک میں ڈاکٹرائن اور پالیسیاں قوم کے منتخب نمائندے پارلیمنٹ میں بحث ومباحثہ کے بعد بناتے ہیں۔ نیشنل سنگل کریکولم اسی پیکج کا ایک حصہ تھا، جس کا کریڈٹ پہلے عمران خان نے لیا اور اب جماعت اسلامی کا تیار کردہ نظریاتی سپاہی احسن اقبال لے رہا ہے۔ جبکہ اسی نصابی کج روی کے تیار کردہ ایک مجاہد کی گولی دو چار انچ ادھر ادھر ہوتی تو ممکن نہ ہوتا کہ آج احسن اقبال ٹویٹ کر کے لکھتا کہ 'سنگل نیشنل کریکولم کا فیصلہ ہو چکا ہے'۔ پراجیکٹ عمران ختم نہیں ہوا بلکہ احسن اقبال کی شکل میں موجود ہے۔

تہتر سال پہلے بابائے قوم نے دو قومی نظریے کی طاقت سے ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیے تھے، لیکن احسن اقبال کو آج تک اس کا یقین نہیں۔ پاکستانی قوم ایک سیاسی اصطلاح ہے جس کو پنجابی بلوچ سندھی اور پختون اقوام نے مل کر تشکیل دیا ہے۔ طارق جمیل ہمیں مزید مسلمان بنانے کے پراجیکٹ پر کام کر رہا ہے تو احسن اقبال یا نام میں کیا رکھا ہے، زید بکر ہمیں مزید پاکستانی بنانے پر لگا ہوا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہر نصابی مضمون میں پاکستان سٹڈیز کو گھسیڑنے سے قوم بنتی ہے نہ مضبوط ہوتی ہے بلکہ قوم مساوی عزت حقوق شعور اور حق ملکیت کا احساس دلانے سے بنتی اور مضبوط ہوتی ہے۔

اٹھارہویں ترمیم کے بعد احسن اقبال کے پاس محکمہ تعلیم کا اختیار نہیں رہا یہ اختیار اب صوبوں کے پاس ہے۔ مشرف آئین کو پامال کر دے تو دفعہ چھ کے سامنے سر جھکایا ہوا مجرم لیکن احسن اقبال آئین کو نہ مانے تو کوئی بات نہیں۔ اور کتنی طاقت چاہیے پہلے صرف ڈکٹیٹر آئین کو نہیں مانتے تھے اب سویلین بھی ایسا کر سکتے ہیں، بہترین مثالیں عمران خان، قاسم سوری، عارف علوی، گورنر چیمہ اور احسن اقبال آپ کے سامنے ہیں۔

پاک سٹڈیز، مخصوص نظریہ اور مسلک کو سپورٹ کرنے والی اسلامیات اور سائنس مضامین کے علاوہ ہر مضمون میں اقبال کے اشعار کی بھرمار سے کوئی فائدہ ہوتا تو پھر مقتدر

حلقے اپنے بچوں کو بیرون ملک کیمبرج اور آکسفورڈ میں پڑھنے نہ بھیجتے۔ کیونکہ وہاں ان کو یہ سب نہیں رٹایا جاتا۔ اگر وہ وہاں سے پڑھ کر محب وطن بن سکتے ہیں اور غدار نہیں کہلائے جاتے تو پھر ہمیں تعلیم کے نام پر پروپیگنڈا پڑھانے کے انتظام پر ہمارے اخراجات اور وقت کیوں برباد کیا جاتا ہے ؟لوگ علم اور تعلیم کو ایک چیز سمجھتے ہیں لیکن علم الگ چیز ہے جبکہ تعلیم ہماری ریاست کی اس کوشش کا نام ہے جس میں وہ سب کو ایک خاص رنگ، محدود سوچ اور مخصوص رویہ دیتی ہے۔ جس کے بعد جو سرکار کہتی ہے "تعلیم یافتہ" وہی کہتا سوچتا سمجھتا اور سچ جانتا ہے۔ کون رحمت اللہ علیہ ہو گا یہ تعلیم کے ذریعے طے ہو جاتا ہے کون ملک دشمن اور غدار ہے یہ انپڑھ سے زیادہ پڑھا لکھا مانتا ہے۔ جہاں سے نکلنے کے بعد سوال اٹھانا، جواب مانگنا، اختلاف کرنا، خود سے سوچنا، ٹھونک بجا کر دلیل سے قبول کرنا اور پرکھنے کے بعد دلیل سے رد کرنا نا قابل قبول جرم سمجھا جاتا ہے۔ اچھی اور خود کفیل زندگی بنانے کے لئے کون سے علوم کون سا رویہ کیسی شخصیت کتنی ذہنی آزادی اور زمانی شعور کی ضرورت ہوتی ہے، پاکستان میں کہیں پڑھایا جاتا ہے تو مجھے بھی بتا دیں میں اپنے بچے وہاں داخل کرانا چاہتا ہوں۔

سنگل نیشنل کریکولم والے ہمیں علم دینے سے زیادہ ایک قوم بنانے کی فکر میں ہیں۔ جس کی قیمت ہماری مادری زبانیں قومی روایات قومی ہیروز شاعر ادیب گلوکار اور لکھاری چکائیں گے اور چکا رہے ہیں۔ ایک پنجابی ادیب جب تک پنجابی میں پرندوں کاشتکاری کے اوزار پودوں فصلوں کیڑے مکوڑوں جڑی بوٹیوں موسموں تقویم رسم رواجوں رویوں قومی شاعروں اور ان کی شاعری لوک کہانیوں اور ان کہانیوں کے کرداروں کے بارے میں مادری زبان میں نہیں پڑھے گا، نہیں سوچے گا وہ کبھی عالمی سطح کی ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ پابلو نرودا اور پاؤلو کوئلو بننے کے لئے مادری زبان میں سوچنا پڑھنا اور لکھنا پڑھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کوئی عالمی ادب پیدا کر سکے نہ ادیب، ڈرامہ تخلیق کر سکے نہ موسیقی ترتیب دے سکے، کیونکہ کریکولم اس کے چشمے خشک کر لیتی ہے۔

احسن اقبال صاحب قابل سیاستدان ہے۔ وہ چاہے تو آگے والوں کو سمجھا سکتا ہے کہ ہم چار پانچ اقوام پر مشتمل ایک ملک کے باشندے ہیں اور اس ملک کے علاوہ ہمارا کوئی اور

ملک نہیں۔ ہم نے اس ملک کے لئے بہت بڑے رقبے والے ہندوستان کو رد کیا تھا۔ ہمارے پاس امریکہ برطانیہ اور یورپ کی نیشنلٹی ہیں نہ گرین کارڈز جہاں ہمارے اکثر مقتدر ریٹائرڈ ہو کر چلے جاتے ہیں، جہاں وہ اپنے بچے اس لیے پڑھاتے ہیں کہ ان کو ہمارے لیے بنائے ہوئے اپنے نصاب کے مثبت نتائج پر اعتماد نہیں ہوتا۔ جب ان کے بچے وہاں سے واپس پاکستان آتے ہیں تو اس پڑھائی کی بنیاد پر ان کو اچھی نوکریاں ملتی ہیں، کیونکہ وہاں پاکستان سٹڈیز پڑھائی جاتی نہ اکنامکس سوکس سوشیالوجی ایجوکیشن اور پولیٹیکل سائنس کی کتابوں میں اقبال کے اشعار ہوتے ہیں۔ اگر ان کے بچے پاکستان سٹڈیز نظریاتی چورن اور علی گڑھ کی کہانیاں نہ پڑھ کر غدار نہیں بنتے تو پھر ہم کیسے غدار بن سکتے ہیں؟ ہمارا تو دوسرا کوئی آسرا بھی نہیں۔ اس لئے جو ان کے اپنے بچے پڑھتے ہیں وہی ہمیں بھی پڑھائیں۔ ستر سال سے زیادہ ہو گیا ہے نظریاتی چورن سے کیا بنا؟

محترم خادم حسین صاحب کے کالم سے مختصر استفادہ کرتے ہوئے، 'سنگل نیشنل کریکولم طبقاتی (تعلیمی) تفریق ختم کرنے کے لئے نہیں ہے ایسا ہوتا تو پھر تعلیم کے لئے بجٹ میں جی ڈی پی کا کم از کم چار فیصد رقم مختص ہوتی جس سے سرکاری سکولوں میں کم از کم بنیادی سہولیات کا بندوبست ہو سکتا۔ اور یوں سرکاری اور اشرافیہ کے لئے بنائے گئے سکولوں کے تعلیمی ماحول میں تفریق ختم ہونے کے امکانات پیدا ہو سکتے۔ واحد نصاب تعلیم آئین کے 20 سے لے کر آرٹیکل 24 تک کی خلاف ورزی ہے جہاں تمام مذاہب کے بچوں کو ان کے مذہب کی تعلیم دینا ان کا بنیادی حق مان لیا گیا ہے اور تمام مذاہب کے لوگوں کے لئے اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کرنے کی آزادی دی گئی ہے۔ اصل میں اس کا مقصد ثقافتی، مذہبی، نسلی، لسانی اور تہذیبی تنوع اور شناختوں کو مٹانا ہے۔ عالمی ماہرین متفق ہیں کہ لسانی، ثقافتی اور تہذیبی تنوع اور رنگارنگی بڑی دولت ہے جس کو یکسانیت کے نام پر ختم کرنے کے تباہ کن نتائج نکل سکتے ہیں۔ اسی پالیسی کی وجہ سے انتہا پسندی اور فرقہ پرستی پروان چڑھی ہے۔ کل بنگالیوں کے متنوع لسانی شناخت کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا جبکہ آج بلوچوں کی بیگانگی کی وجہ بھی یہی ہے۔

ہم پاکستان کے مالک اور وارث ہیں

وطن عزیز میں کچھ عزیزوں کو یہ زعم ہے کہ اگر یہ ملک انہوں نے صحیح راستے پر نہیں ڈالا تو اس کا چلنا مشکل ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستانی حقیقی معنوں میں قوم نہیں، ایک بے شعور ہجوم ہے، جن کو وہ مسلسل قومی سانچے میں ڈھال رہے ہیں، قوم کی رہنمائی کے جملہ حقوق انہی کو حاصل ہیں۔ اس لئے وہ اپنا حق رہنمائی گاہے بگاہے استعمال کرتے ہوئے، ملک کے قطب نما کی درستی کی خاطر وہ کچھ بھی کر گزرتے ہیں، جس سے قوم بالکل بھی متفق نہیں ہوتی۔ ساتھ ساتھ ان کو یہ بھی وہم ہے کہ وہ رہنمائی نہیں کریں گے تو کوئی ناگہانی آفت آسکتی ہے۔ ان کے ڈر اپنی جگہ، لیکن وہ زمینی حقائق کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ یہاں تک کہ یہ بھی نہیں، کہ ایٹمی طاقت اور عسکری ریاست ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ملک بائیس کروڑ ننگے بھوکے اور نیم خواندہ پاکستانیوں کی پدری جائیداد اور آخری مورچہ ہے، جس کا ایک ایک مرلہ ان کے نام انتقال شدہ ہے، اور اس ایک ایک مرلے کی خاطر وہ دس دس دفعہ مرنے اور سو سو دشمن مارنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس ملک کے چلانے میں ان کے مشورے، شراکت داری اور مرضی کو کسی نے بھی کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ لیکن ان بدحال پاکستانیوں کے کہیں کسی اور ملک میں گھر ہیں، جائیدادیں ہیں، اولادیں یا روزگار، اور نہ ڈالر اور یورو اکاؤنٹ۔ جنہوں نے کبھی ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف سے قرضے لیے ہیں نہ ملک لوٹا ہے، نہ کسی کے ساتھ تزویراتی اور نظریاتی مقاصد کے تحت شراکت داری کی ہے، نہ ترقی

کے نام پر اور نہ اسلحے کے بدلے میں اس ملک کو گروی رکھا ہے۔ یہ خود امریکہ، برطانیہ اور یورپ کی اعلیٰ یونیورسٹیوں میں پڑھے ہوئے ہیں نہ ان کے بچے وہاں پڑھتے ہیں، لیکن ٹوٹے ہوئے بنچوں اور بغیر بجلی کے سکولوں اور کالجوں میں، دنیا اور مافیہا سے بے خبر اساتذہ سے، پاک سٹڈیز اور خصوصی وضع کردہ جنگی اور فرقہ وارانہ اسلامیات کے رٹائے گئے اسباق لینے کے باوجود بھی، جب بھی موقع پاتے ہیں، تعلیمی آئیوڈین کے اثرات سے آزاد رہ کر ملک و قوم کی بہتری میں شاندار اور ناقابل یقین سیاسی فیصلے کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہر الیکشن کے انعقاد کے بعد "بندوبستیوں" کی مایوسی قابل دید ہوتی ہے۔

جی ہاں ہم وہی ہیں جو مسجد میں نماز پڑھنے جاتے ہیں تو اپنے بھائیوں کے ساتھ صف میں کھڑے ہونے سے پہلے اپنی چپل گزشتہ تجربات کی روشنی میں اپنے سامنے رکھتے ہیں، لیکن نماز پڑھنا نہیں چھوڑتے۔ ہم وہی ہیں جو نیکی کی نیت سے ٹھنڈے پانی کا کولر سر بازار رکھیں تو چوری ہو جانے کی ڈر سے گلاس کو لوہے کی زنجیر سے باندھتے ہیں، لیکن ٹھنڈا پانی پلانا نہیں چھوڑتے، ہم وہی ہیں جب زلزلہ آ جائے تو ٹرک بھر بھر کر خوراک، گرم کپڑے اور بستر اپنے مصیبت زدہ بہن بھائیوں کو بھیجتے ہیں اگرچہ وہ راستے میں دوسرے لوگ لوٹ لیتے ہیں، پھر بھی ہم ایک دوسرے کی امداد سے ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ ہم وہی ہیں کہ جب سیلاب اور فوجی آپریشنز کی وجہ سے ہمارے ہم وطن بے گھر ہو جائیں تو ہم اپنے گھروں سے بیٹے کی تعلیم، بیٹی کے جہیز، یا بڑھاپے کی خاطر پس انداز کی گئی رقم مصیبت زدہ بھائیوں میں تقسیم کرنے پہنچ جاتے ہیں، اگرچہ اس میں بھی اکثر اشیا مذہبی شدت پسندوں کے ہاتھ لگ جاتی ہیں لیکن ہم اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ ایدھی ہو یا عمران، مسیحا ہو یا دجال، ہم سے جب بھی اللہ کے نام، انسانیت کی خاطر یا قوم اور وطن کی بہتری کے لیے مانگا گیا، ہم نے اپنا پیٹ کاٹ کر دیا ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کورونا میں بائیس کروڑ محصور لوگوں کو حکومت نے کتنی سرکاری امداد دی تھی، جس کی بین الاقوامی اسناد وہ ہمیں دکھاتی پھرتی ہے؟ وہ ہم تھے جس نے ایک روٹی کھائی اور دوسری اپنے ہمسایہ کے گھر بھیجی۔ این ڈی ایم اے یا باہر کی دنیا خاک جانتی ہے؟ ہم ہی ٹائیگر ہیں اور ہم ہی فورس۔

پچھلے سال کے لاک ڈاؤن کے دوران، فلیٹ کی گھنٹی رات گئے بجی، میں نے دروازہ کھولا، تو ایک عام پاکستانی کھڑا تھا، ساتھ میری دہلیز پر آٹے کی بوری، گھی کے کنستر، چینی سے بھرے ہوئے دو شاپر، پتی کے پیکٹس، سرف اور صابن پڑا تھا، میں نے پوچھا، یہ کیا ہے؟ اس نے کہا، آپ کا حصہ۔ میں نے انکار کیا کہ کسی ضرورت مند کو دے دیں، میں تو برسر روزگار ہوں۔ اس نے جواب دیا، سب کو دے دیا ہے، آپ اپنے علاقے سے دور ہیں اور ہم سب مقیم، اس لئے یہ آپ کا حصہ ہے۔ خود کو اکیلا نہ سمجھیں۔ (یہ پنجاب کی کہانی ہے)

ہم مزدور ہیں، اپنے گھر بھی چلاتے ہیں، بچوں کو تعلیم بھی دلاتے ہیں، ان کو قوم کی حفاظت کے لیے فوج اور پولیس میں بھرتی ہونے کے لیے بھی بھیجتے ہیں اور ٹیکس کی سکت نہ رکھنے کے باوجود، استعمال کرنے والی ہر چیز پر ٹیکس دے دے کر حکومت کا سفید ہاتھی بھی پالتے ہیں۔ ہم نہ کم ہیں نہ کمزور، لیکن وطن کے معاملات میں ہماری مداخلت، شراکت، حق ملکیت اور مرضی روز بروز کم سے کم تر ہوتی جارہی ہے۔ جس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ہم سب کچھ سے لاتعلق ہوتے جارہے ہیں بلکہ اب سب کچھ کا مذاق اڑانے لگے ہیں۔

کوئی کسی ائیرپورٹ پر ہمارے وزیر اعظم کی توہین کرے، کسی ملک میں، اس قرض میں، ہمارا جہاز پکڑا جائے جو ہم نے کبھی لیا ہی نہ ہو، ہماری ایمبیسی کا اکاؤنٹ فریز ہو جائے، ہمارا ہوٹل پکڑا جائے، یا کچھ اور، تو اب ہم اس پر افسوس نہیں کرتے، ہم اس کو اپنا نقصان، اپنی توہین نہیں سمجھتے، بلکہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ نفسیات کے علما بے بسی اور مایوسی کی آخری سرحد پر پہنچے ہوئے فرد کی خود فراموشی کی حالت میں اپنے آپ پر ہنسنے کی بات بہت پہلے کر چکے ہیں۔.

مصنوعی پنیریوں اور نرسریوں کے ذریعے قومیں بنتی ہیں نہ پنپتی ہیں۔ اگر مصنوعی ذرائع یا قلمی کاشت کاری یا زور زبردستی سے قومیں بنائی جاسکتیں، تو روس جیسی فوجی اور ماضی کی صنعتی طاقت، تاجکستان، ازبکستان، ترکمانستان، کرغیزستان اور ازبکستان کے نام، زبان، مذہب اور کلچر کو بالکل ختم کر چکی ہوتی۔ خالی خولی مبہم نظریات سے قومیں بنتیں تو یوگو سلاویہ آج کروشیا، سلووینیا، مسوڈونیا، بوسنیا، ہرزیگوینا اور سربیا میں تقسیم نہ ہوتا۔

ممالک اور اقوام کی مضبوط بنیادوں اور دیرپا عمارت کے لیے جمہوری اقدار، برابری، قانون کی عملداری، غیر مبہم اور متفقہ آئینی بندوبست، حکومتی معاملات میں عوام کی مرضی سے ان کی شمولیت، ان کی زبان، عقائد، کلچر، تاریخ، روایات اور ہیروز کو مطلوبہ مقام اور اہمیت دینا، ملکی وسائل اور دولت میں ان کو نہ صرف حصہ دار بنانا بلکہ ان کو اس کی ملکیت کا احساس دلانا بہت ضروری ہوتا ہے۔

حملہ آوروں کی تاریخ، عربی کلچر، غیر ملکی ہیروز، اقلیت کی زبان، سارے کے سارے بہت نازک سہارے ہیں۔ سرکاری پنیری میں اگائے گئے سیاسی بونے اور فرقوں، مذہبوں اور مولویوں کے ذریعے تقسیم کردہ قوم جس کا نعرہ لا الہ الا اللہ ہو، لیکن جو ایک ساتھ ایک دن روزہ رکھ سکتی ہو نہ عید کر سکتی ہو، ان کے لئے افسانوی تاریخ اور الوہی نظریات کی بجائے، بہت گہری اور مضبوط حقیقی بنیادوں کی ضرورت ہے۔

اردو زبان میں ملکی زبانوں کے الفاظ، ضرب الامثال نئے قواعد وضوابط کی شمولیت پر میں نے 23 جنوری 2021 کو شائع شدہ اپنے کالم ”اردو زبان اور اس سے جڑے ہوئے مسائل“ میں مختصر بات کی ہے، ان اصولوں کو مد نظر رکھ کر اردو زبان کو پاکستانی زبان کا نام دیا جاسکتا ہے، لیکن یہ سب 73 سال پہلے ہونا چاہیے تھا، جب اردو کو پاکستان میں قومی زبان بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اگر ملک کو مزید نسلی لسانی علاقائی مذہبی اور فرقہ وارانہ خطوط پر تقسیم کرنا مقصود نہ ہو اور قوم کو حقیقی معنوں میں پاکستانی بنانے کا ارادہ ہو تو یہاں پر رہائش پذیر سب اقوام کو برابری کی سطح پر تسلیم کرتے ہوئے ان کی زبانوں کو قومی زبانیں مان لی جائیں۔

ایک سو 33 بڑی زبانیں بولنے والے انڈیا میں آٹھ قومی زبانیں ہیں تو ہم اپنی چار پانچ زبانیں برابری کی بنیاد پر قومی زبانیں کیوں تسلیم نہیں کر سکتے؟ ہر صوبہ سالانہ دس دس ہزار کی تعداد میں قابل بچے دوسرے صوبوں میں سرکاری سرپرستی میں حصول تعلیم کے لئے بھیجے اور خود دوسرے صوبوں کے قابل بچے قبول کرے، ان سارے بچوں کو سرکاری خرچے پر آٹھویں سے گریجویشن تک بہترین اساتذہ کی نگرانی میں تعلیم دلائی جائے، جس میں ”متفقہ قومی نصاب“ کے ساتھ ساتھ، اس صوبے کی زبان میں، اسی صوبے کی عوامی تاریخ،

کلچر، روایات، ہیروز اور ادب پر مشتمل کتاب میں، اعلیٰ درجے کی کامیابی کو لازمی کر دی جائے۔ دوسرے صوبوں سے وہاں کی زبان کے ماہرین خاص تعداد میں اپنے صوبے میں اساتذہ اور لیکچررز کے طور پر بھرتی کیے جائیں، اور اپنی زبان کے ماہرین اساتذہ کے طور پر دوسرے صوبوں میں بھیجے جائیں، جو بقایارہ جانے والے بچوں کو آٹھویں سے گریجویشن تک، مذکورہ اساتذہ کی مادری زبان میں تیار کردہ عوامی ادبی اور ثقافتی تاریخ اپنے علاقے میں پڑھائیں۔ اس طرح ایک صوبے کے لسانی اور تاریخی ماہرین کو دوسرے صوبے میں نہ صرف روزگار مل جائے گا بلکہ ثقافتی، نسلی اور لسانی حدبندیاں بھی ختم ہونا شروع ہو جائیں گی۔

ایک دوسرے کے صوبوں میں تعلیم حاصل کرنے والے بچے مستقبل میں نہ صرف یہ کہ اپنے صوبوں میں دوسرے صوبوں کی زبان، تاریخ اور ثقافت کے ماہرین شمار ہوں گے بلکہ ان کو اپنے صوبے میں دوسرے صوبے کی زبان و ثقافت پڑھانے کے مواقع بھی میسر ہوں گے۔ ساتھ ساتھ وہ دوسرے صوبوں میں جا کر وہاں بھی اساتذہ کا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس طرح آنے والے بیس سال میں ہم لاکھوں ایسے پنجابی، سندھی، بلوچ، پختون اور سرائیکی پاکستانی تیار کرنے کے قابل ہو جائیں گے جو پنجابی سے پنجابی، بلوچ سے بلوچی، پختون سے پشتو، سرائیکی سے سرائیکی اور سندھی سے سندھی زبان میں بات چیت کرنے، نصاب پڑھانے اور اپنا روزگار کرنے کے قابل ہوں گے۔

ایک دوسرے کی زبان سیکھنے اور اس میں اپنا مدعا بیان کرنے سے بہت ساری دیدہ اور نادیدہ دیواریں گرائی جا سکتی ہیں، جھوٹ، نفرت، پروپیگنڈے، غلط سلط روایات، توہین آمیز لطیفوں، برخود غلط تعلی، تنگ نظری، نسل پرستی، علاقائی اور فرقہ وارانہ تعصبات کے خاتمے کے علاوہ ففتھ جنریشن تو کیا اس طرح ہر جنریشن کی جنگ وجدل کا جواب دیا جا سکتا ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ غداری کے تمغے دینا فوجداری قوانین کے تحت قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے۔ فتویٰ گردی بھی دہشت گردی کی طرح قابل دست اندازی پولیس جرم قرار دیا جائے۔

ہم میں سے غالب اکثریت اس ملک کے قدیم باشندے ہیں، ہمیں کسی نے فتح کر کے

اس ملک میں زبردستی شامل کیا ہے نہ ہم کوئی مقبوضہ کالونی ہے بلکہ ہم اپنی مرضی سے اپنی زمین پر آباد ہیں۔ قانون کی عملداری، آئین کی پاسداری، برابری، معاشی انصاف، جمہوری طرز حکومت اور انسانی سیاسی حقوق کی حفاظت اور فراہمی ریاست کی اولین ترجیحات میں شامل ہو تو کوئی موہوم اور کتابی نظریہ ہو یا نہ ہو، ہم رہیں گے اور یہ ملک بھی ہو گا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، کیونکہ یہ ہمارا پہلا اور آخری ملک ہے، دنیا کا کوئی بھی ملک ہم عام پاکستانی کو ویزہ دینے کا روادار نہیں، انڈہ ٹوٹ کر آملیٹ بنے تو پھر اس سے انڈہ نہیں بن سکتا۔

مشرقی پاکستان، تین جرنیل اور بین الاقوامی پٹواری

پاکستان ایک ایسی چراگاہ ہے۔ جس میں کئی مقدس گائے کھلم کھلا چرتیں اور آرام سے جگالی کرتی ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں اللہ میاں کی گائے بھی موجود ہیں۔ جن کو ضرورت پڑنے پر قربانی کے بکرے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ حال ہی میں کسی نامعلوم جنگ کے دوران ستر ہزار کی بکروں کی طرح قربان دی گئی۔

مقدس گائیں تعداد میں کم اور اللہ میاں کی گائیں تعداد میں زیادہ ہیں۔ اس لئے مقدس گائے کی حفاظت کیلئے تقدیس کا ایک ہالہ ہمہ وقت اسکے چاروں طرف موجود ہوتا ہے۔ جس کو اللہ میاں کی گائے دیکھ کر کم مائیگی کی وجہ سے اپنی جگالی کرنا بھول جاتی ہیں بلکہ بعض تو راتوں کو برے برے خواب بھی دیکھتی ہیں۔

یہ مقدس گائیں صرف عسکری ادارے عدلیہ یا پارلیمنٹ یا ان اداروں میں بیٹھے تقدس مآب ہستیاں ہی نہیں بلکہ قومی سانحات، حادثات، واقعات، انکوائریاں، کمیٹیاں اور ان کے مرتب کردہ رپورٹس بھی ہیں۔ جن سے اللہ میاں کی گائے ان کی اپنی حفاظت کی خاطر دور رکھی جاتی ہیں۔ خود اللہ میاں کی گایوں کو بھی یقین ہے کہ ایسے معاملات سے جتنا دور رہا جائے عظیم تر قومی مفاد کیلئے اتنا بہتر ہے۔ سانحہ مشرقی پاکستان اس کے حقیقی کردار اور اس کی انکوائری رپورٹس بھی اس وجہ سے ایک مقدس گائے بنی ہوئی ہیں۔ اس لیے پاکستان میں اس کے بارے میں کم لکھنا کم جاننا کم بحث کرنا خود تحقیق نہ کرنا اور سرکار کے مہیا کردہ

چارے پر جگالی کرنا بہترین حکمت عملی ہے۔ سولہ دسمبر تب سے لاش جیسا ٹھنڈا اور دھند میں لپٹا ہوا گذرتا ہے۔ ورنہ یہ دن جتنا اے پی ایس کے معصوم بچوں کے خون سے تربتر ہے اتنا عشروں پہلے مشرقی پاکستان کے گلی کوچوں ندی نالوں دریاؤں اور سمندر میں پڑی پھولی ہوئی لاوارث لاشوں سے بھی اٹا ہوا ہے۔ سرکار نے سرکاری منشی (بقول جنرل نیازی) یعنی صدیق سالک کے ذریعے قوم کو سمجھایا کہ جنرل نیازی شراب اور عورتوں کا رسیا تھا جنگ لڑنے سے زیادہ پان کی سمگلنگ میں مہارت رکھتا تھا۔ بین الاقوامی اخباری رپورٹروں کے سامنے "اوور مائی ڈیڈ باڈی" کی شیخی مارتا اور واپس آکر زنانیوں کی طرح روتا۔ فرمائشی سرکاری منشی کے بعد حمود الرحمن کمیشن بنا کر رپورٹ تیار کی گئی، اسے بھی مقدس گائے بنا کر اللہ میاں کی گایوں سے دور رکھی گئی۔ جبکہ یہ رپورٹ انہی کیلیئے تھی۔ (پاکستان میں ہر سانحے کی رپورٹ عوامی مطالبے پر تیار کی جاتی ہے لیکن تیاری کے بعد عوام کیلیئے نہیں ہوتی)۔ حمود الرحمن کمیشن رپورٹ بیرون ملک سے عوام تک تب پہنچی جب عوام بھول گیا تھا کہ پاکستان ایک نہیں دو تھے، جس میں بھی وہی شراب و شباب کی کہانی درج تھی۔ یہ رپورٹس پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے انڈین آرمی طارق جمیل کے ساتھ 'اللہ کی راہ میں' چالیس دن گزارنے کے بعد میدان جنگ میں آئی تھی۔ قید سے واپس آنے کے بعد چنتخب ولن جنرل نیازی کو قوم کے سامنے اپنی بات کہنے سے روکنے کی خاطر پریس سے دور رکھا گیا۔ اسکی خواہش کے برعکس اس پر مقدمہ چلا کر کورٹ مارشل کیا گیا نہ اس سے اس کی کہانی سنی گئی۔ جبکہ ہر ملزم کو اپنی صفائی پیش کرنے کی اجازت دی جاتی ہے تب فیصلہ سنایا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں ان سارے الزامات کو مسترد کرتے ہوئے جواب دیا ہے جو بقول ان کے سرکاری منشی نے فرمائشی کتاب میں اس کے خلاف لگائے ہیں۔ وہ جواب میں صدیق سالک کی دوسری کتاب ہمہ یارانِ دوزخ کو حوالے کے طور پر پیش کرتا ہے، جس میں سالک نے جنرل نیازی کے بارے میں کچھ اور لکھا ہے۔

جنرل نیازی لکھتا ہے، کہ ٹائیگر نیازی کا تمغہ اس نے آرمی کینٹین سے خرید کر سینے پر نہیں سجایا تھا بلکہ یہ اسکی بے خوفی بہادری اور کامیاب عسکری کیریئر کی وجہ سے اسے اس کے

سینئر انگریز افسر نے دیا تھا۔ اس نے اپنے تمغوں اور تعارفی اسناد کا ذکر کرتے ہوئے ان عسکری افسروں کی نشاندھی بھی کی ہے جنہوں نے دوران جنگ لڑنے کی بجائے فوج سے استعفیٰ دیئے اور انکا ذکر بھی کیا ہے جنہوں نے اس کے جانے سے پہلے مشرقی پاکستان کے عوام پر دشمن کی طرح ظلم کے پہاڑ توڑے، جس کی وجہ سے مصالحت کے تمام راستے مسدود ہوگئے تھے۔ اس نے لکھا ہے کہ جب کوئی بھی افسر مشرقی محاذ پر جانے پر تیار نہیں تھا تو اس نے بغیر بحث و تمحیص کے مشرقی محاذ پر فی الفور جا کر ڈیوٹی جوائن کی، کم ترین اور ناکارہ آلات حرب اور تھکے ہوئے سپاہیوں کے ذریعے، جن کے پاس مناسب طبی سہولیات بھی نہیں تھیں، نو مہینے تک ملک کے چپے چپے کا دفاع کیا۔ جب انڈین افواج سرحدات پر جمع ہو رہی تھیں تو اسے ان کے خلاف گوریلہ کاروائیاں کرنے سے منع کیا گیا، اس کے منع کرنے کے باوجود مغربی محاذ پر جنگ شروع کی گئی جس کی وجہ سے انڈین فوج کھلم کھلا مشرقی پاکستان میں گھس آئی۔ جب 'مغربی محاذ سے مشرقی محاذ کی دفاع' کا منصوبہ بنایا گیا تھا تو پھر تیرہ دن انتظار کیوں کیا گیا؟ اور جب حملہ کیا گیا تو وہاں پر کونسی فتح حاصل کی گئی؟ وہ لکھتا ہے کہ میں تو بدترین حالات، کم ترین اور ناکارہ آلات حرب، تھکے ماندے لاوارث اور زخمی سپاہیوں کے ساتھ، گھر سے ہزاروں میل دور، چاروں طرف سے دشمن کے نرغے میں نو مہینے تک لڑتا رہا اور کمانڈر انچیف کے حکم پر ہتھیار ڈالے، لیکن مغربی محاذ پر سب کچھ میسر ہونے کے باوجود چار ہزار مربع کلومیٹر علاقہ دشمن کے حوالے کرنے والے کون تھے؟ ان کو کیا سزا ملی؟ اپنے فوجی افسران کی مجرمانہ غفلت اور سازشوں کے علاوہ اس نے جنرل گل حسن اور 'بچر' ٹکا خان کے ساتھ ساتھ بھٹو کو بھی برابر کا سازشی قرار دیا ہے۔

انڈین سائڈ سے مشرقی پاکستان کے بارے میں جنرل جیکب اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ہم نے سرنڈر سے ایک ہفتہ پہلے مشرقی پاکستان کے گورنر ہاؤس میں پاکستان کے سول اور عسکری افسران سے ملاقات کر کے معاہدہ کیا۔ پاکستانی عسکری افسران کی خواہش تھی کہ وہ سویلین یعنی بنگالیوں کی بجائے انڈین آرمی کے سامنے ہتھیار ڈالیں کیونکہ سویلین کے سامنے ہتھیار ڈالنا برٹش آرمی کی روایت نہیں تھی، جس کا دونوں پچیس سال پہلے حصہ تھے۔ جنرل

جیکب کے بقول ہمارے پاس اتنے جنگی قیدیوں کو رکھنے کا کوئی بندوبست نہیں تھا اس لئے یہ بندوبست کرنے کیلئے ہم نے پاکستانی افسران سے ایک ہفتے کا وقت لیا۔

اگر جنرل نیازی چالاکی کرکے انڈین آرمی کے سامنے ہتھیار نہ ڈالتا اور بنگالیوں کے سامنے سرنڈر کرتا تو ایک ایک سپاہی اور سویلین کو بدترین تشدد کے بعد تہہ تیغ کیا جاتا۔ اس لئے ایک ہاری ہوئی جنگ میں نوے ہزار جانیں بچا کر واپس لے آنے پر میں جنرل نیازی کی ہمیشہ قدر کرتا رہا ہوں۔

شمالی مردان کے علاقے گوجر گڑھی کے بخاری استاد (مولوی) کے دو بیٹے انڈیا میں قید تھے جن کا ذکر مولوی صاحب ہر جمعے کے خطبے میں بزدل کہہ کر کرتا رہا، کہتا کہ اگر وہ بزدل نہ ہوتے تو ہندو کے سامنے ہتھیار کیوں ڈالتے؟ اس کے بیٹے واپس آئے تو اس نے ان کا استقبال نہیں کیا۔ لیکن جب لوگوں نے دیکھا تو ایک کی بائیں ٹانگ گھٹنے سے نیچے نہیں تھی اور دوسرے کا بازو کاندھے کے نیچے سے غائب تھا۔

انڈیا بنگلہ دیش اور پاکستانیوں کے علاوہ اس جنگ کا ایک اور فریق بھی تھا۔ 1946 میں کابینہ مشن نے ہندوستان کو تین گروہوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ ہندوستانیوں کو پیش کیا تھا، جو کانگریس اور مسلم لیگ نے مختلف وجوہات کی بناء پر مسترد کر دیا تھا۔ لیکن حیران کن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان آج انہی تین گروہوں میں تقسیم ہے جس کا مشورہ کیبنٹ مشن ساتھ لایا تھا۔

انڈیا کو تقسیم کرنے کے لیے مسلمانوں کی اکثریت بنانے کی خاطر یا جناح صاحب کی ضد کی وجہ سے تقسیم کے وقت ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا، اگرچہ جناح صاحب خود بھی آخری دنوں میں متحدہ بنگال کو الگ ملک بنانے پر تیار ہو گئے تھے لیکن ناکام رہے تھے۔ تاہم پچیس سال تک اسی برطانیہ کے ایجنٹوں نے پاکستان پر حکومت کرکے برطانیہ کے تقسیم کے نامکمل ایجنڈے کی تکمیل کر دی۔ اس لئے جنرل جیکب، جنرل یحییٰ، جنرل نیازی اور بھٹو بین الاقوامی پٹواریوں کے سامنے نئے رقبے کے انتقالات ہونے کے دوران مالکان کی تصدیق کرنے والے نمبرداروں سے زیادہ کچھ نہیں تھے۔ ان میں نہ کوئی بہادر نہ بزدل نہ

سازشی اور نہ محب وطن تھا۔ وہ سارے استعمال ہوئے اور کیوں استعمال ہوئے مختصراً نیچے لکھ رہاہوں اگرچہ یہ موضوع ایک پورے کالم کا متقاضی ہے۔

دنیا پاکستان کو روس کے خلاف تیار کرنا چاہتی تھی لیکن وہ امداد مشرقی پاکستان میں بھی استعمال ہو جاتی تھی اور جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان منصوبہ سازوں کیلئے ایک غیر ضروری بوجھ بنا ہوا تھا جس کو وہ اپنے (پاکستان کے) کاندھوں سے اتارنا چاہتے تھے۔ جونہی وہ بوجھ اتارا گیا، تو چند سال پہلے ننگے عوام سے شکست کھانے والی فوج دنیا کی بہترین فوج بنی، ایٹمی ہتھیاروں سے لیس کر دی گئی، نمبر ون جاسوسی ایجنسی کی مالک بنا دی گئی اور سوویت یونین تہس نہس کر دی گئی جبکہ دوسری طرف ننگا بنگال آج ساری دنیا کو کپڑے مہیا کرنے لگا ہے کیونکہ اس نے فوج کی بجائے عوام اور معیشت میں سرمایہ کاری کرنا پسند کی۔

تقسیم ہند کا خونخوار اور حیران کن قصہ

ریڈ کلف نے چار لاکھ پچاس ہزار مربع کلو میٹر کا علاقہ، جس میں آٹھ کروڑ اٹھاسی لاکھ لوگ رہائش پذیر تھے، محض پانچ ہفتوں میں تقسیم کرنا تھا جبکہ اتنے دنوں میں تو لوکل پٹواری کی نگرانی میں ایک گاؤں کی تقسیم ممکن نہیں ہے، پھر پنجاب بارڈر اور بنگال بارڈر کے درمیان دو ہزار کلو میٹر کا فاصلہ بھی موجود تھا۔ وقت کی قلت کے علاوہ برسات اور گرمی کی وجہ سے سفر اور تقسیم کے مقامات تک پہنچنا نا ممکن تھا۔ یاد رہے ریڈ کلف زندگی میں پہلی دفعہ انڈیا آیا تھا۔ یہاں کی گرمی حبس اور برسات اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

ممالک کی تقسیم کے لئے معیاری طریقہ کار اور مطلوبہ ماہر مشیران ریڈ کلف کے پاس موجود ہونے کی بجائے اس کے پاس صرف دونوں مجوزہ ممالک کے نمائندے تھے جن کا واحد مقصد اپنے اپنے مفادات کا تحفظ اور زیادہ سے زیادہ مراعات کا حصول تھا۔ اس لیے وہ ریڈ کلف کے مددگار تو کیا بنتے بلکہ الٹا مداخلت کار تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تقسیم ہونے والے علاقے کے جغرافیے اور آبادی کے بارے میں بنیادی معلومات اور ان کے ذہنی، مالی، مذہبی اور سیاسی رجحانات سے مکمل بے خبر تھا۔

ریڈ کلف کے ساتھ تیسری غیر جانبدار نگران جماعت یعنی اقوام متحدہ کی نمائندگی کرنے والی پارٹی موجود ہی نہیں تھی جو ایسے معاملات میں عموماً موجود ہونی ضروری ہوتی ہے۔ کیونکہ بین الاقوامی بارڈر اور معاہدوں میں اس کی موجودگی ایک معیاری طریقہ کار

ہے۔ اپنی غیر جانبداری بر قرار رکھنے کی خاطر ریڈ کلف برطانوی حکومت کے نمائندوں اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے فاصلے پر رہا جس کی وجہ سے ہندوستان کے بارے میں اس کے معلومات مزید محدود اور ناقص ہو گئے۔

یہ تقسیم آبادی، جائیداد، رشتہ داری، رعایت، آسانی، سیاسی اور اقتصادی رجحانات، زبان، کلچر اور انسانی جذبات و احساسات کی بجائے محض مذہبی بنیادوں پر استوار تھی پھر ریڈ کلف کے پاس مطلوبہ ڈیٹا اور ضروری مہارت بھی ناپید تھی۔ مزہبی بنیادون پر ہندو سکھ اور مسلمان بارڈر کمیشن کے ممبران بنائے جانے سے اس کیلئے مشکلات مزید بڑھی ہوئی تھیں۔ (بارڈر کمیشن کے سکھ نمائیندے کے دو بچے اور بیوی کو چند دنوں پہلے فسادات میں مارا گیا تھا) بارڈر کمیشن میں فریقین کی بجائے غیر جانبدار بین الاقوامی نمائیندے لینے چاہیے تھے۔

تقسیم، ہندو اور مسلم مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان تھی لیکن پنجاب میں سکھوں اور چٹا گانگ میں بدھوں کی آبادی، علاقے اور جائیدادوں کو تقسیم کیا گیا۔ سکھوں کی پھر بھی خواہش اور آواز موجود تھی بدھ مذہب کا تو کوئی نمائندہ بارڈر کمیشن میں موجود نہیں تھا۔ بارڈر صرف برٹش کنٹرول انڈیا میں کھینچنی تھی لیکن چھ سو کے قریب دیسی ریاستوں کو بغیر کسی فیصلے کے چھوڑا گیا جن کی آبادی کل ہندوستانی آبادی کا چالیس فیصد تھی جس کی وجہ سے ابتدا سے دونوں تقسیم شدہ اقوام کے درمیان اختلافات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ یوں جوناگڑھ کے راجہ اور عوام کی طرح کشمیر کے راجہ اور عوام کی مذہبی بنیادوں پر ایک دوسرے کے ساتھ اور اخر کار نئے بنے ہوئے ممالک کے ساتھ اور دونوں ممالک کے درمیان مسائل بنے۔ بڑی اور اہم ریاستیں جیسے گوالیار، جودھ پور، راوا، حیدرآباد، جیسلمیر وغیرہ انڈین علاقے میں آتی تھی اس لیے زبردستی بھارت میں شامل کی گئیں جبکہ ہندو اکثریتی علاقہ کھلنا اور بدھسٹ اکثریتی علاقہ چٹا گانگ پاکستان کو دیا گیا۔ دوسری طرف مسلم اکثریتی علاقے مرشد آباد اور مالدہ انڈیا کے پاس رہ گئے۔ اسی طرح سکھوں کی بڑی آبادی پر مشتمل علاقے لاہور، راولپنڈی اور ملتان پاکستان کو ملے اور مسلمانوں پر مشتمل بڑی آبادیاں

لدھیانہ، گورداسپور اور جالندھر انڈیا لے گیا اس کے علاوہ سندھ کی تقسیم کی وجہ سے ہندوؤں کی پندرہ لاکھ آبادی پاکستان میں رہ گئی۔ میز پر بیٹھ کر نقشے پر لکیر کھینچنے کی وجہ سے کاشتکار ایک ملک اور اس کی زمین دوسرے ملک میں رہ گئی اس لئے آج بھی بنگال میں ایسے گھر موجود ہیں جن کا ایک کمرہ ایک ملک اور دوسرہ کمرہ دوسرے ملک میں واقع ہے۔

ایک کمال یہ کیا گیا کہ علاقون کی تقسیم کا اعلان، آزادی کے اعلان کے دو دن بعد کیا گیا یوں کئی دن تک انتظامیہ اور آبادی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کا تعلق کس ملک سے ہے مثلاً مشرقی پاکستان میں مالدہ پر کئی دن تک پاکستان کا جھنڈا لہراتا رہا لیکن بعد میں انڈین انتظامیہ قانونی کاغذات اور نقشوں سمیت آیا اور مالدہ انڈیا کا حصہ بنا۔

پنجاب میں ایک کروڑ چالیس لاکھ ابادی کے منتقلی اور مہاجرین کی حفاظت کے لئے صرف پچاس ہزار حفاظتی دستے موجود تھے یوں فی کلومیٹر ایک سپاہی کی موجودگی بھی ممکن نہیں تھی۔ تقسیم کا اعلان دن تک نہ ہونے کی وجہ اور پولیٹیکلی چارج ماحول کی بنا پر فریقین کے درمیان مخاصمتیں مزید بڑھیں جو بعد میں غلط علاقوں میں موجود لوگوں کی قتل عام پر منتج ہوئی۔

چائے کیسی تھی؟

جنگ میں دوسرا حملہ سچائی پر کیا جاتا ہے، جبکہ پہلے حملے میں انسانی دانش قتل کیا جاتا ہے اور پھر پاگل پن ننگا ہو کر بڑے فخر سے انسانی کھوپڑیوں کے میناروں، ہوا میں تحلیل ہوتے ہوئے زندہ جسموں، سسکتے ہوئے زخمیوں، بلکتے ہوئے یتیموں، چوڑیاں توڑتی اور سیندور مٹاتی ہوئیں سہاگنوں کی بیوگی کو، بہادر، سورما، سرفروش، جنتی، سورگباشی، نعرہ علی اور ہر ہر مہادیو کے خوبصورت پیراہن پہنا کر باقی عمر بیچتا ہے۔ اسلحے کے سوداگر اور کمیشن کھانے والے دلال موٹے ہو جاتے ہیں اور جنگ میں یتیم ہونے والے بچے گرائے گئے جہازوں کے ٹکڑے اور پھٹے ہوئے بموں کے حصے بیچتے بیچتے کباڑیوں کی قوم بن جاتی ہے۔ جنگ کے بعد جس سے بات کرو وہ جیتا ہوا ہوتا ہے البتہ اپنا نقصان، موسم کی خرابی، قسمت کی خرابی، بندوق اور جہاز کی خرابی، دشمن کی چالاکی اور مکاری کی وجہ سے ہوا ہوتا بتاتا ہے۔

جنگ انسانیت کے خلاف سب سے بڑا اور منظم جرم ہے جس کو ہمیشہ دیوتا بنا کر پوجا گیا اور جس کے چرنوں میں زیادہ تر معصوم اور بے گناہوں کی بلیلاں چڑھائی گئیں۔ جب ایک شخص قتل کرتا ہے تو پولیس قانون عدالت اسے پکڑ کر اس کے جرم پر سزا دیتی ہے لیکن جب پوری قوم پاگل بن کر دوسری قوم کو قتل کرنے کے لئے اپنی پوری توانائیاں، نفرتیں، بدنیتیاں، اسلحہ، گولہ بارود استعمال کرنے پر تیار ہو جاتی ہے تو اسے عظیم ترین جذبہ، ملک و قوم سے وفاداری، حب الوطنی، قربانی اور بہادری کے مقدس اور پوتر زمزم اور گنگا سے

اشنان کرا دیا جاتا ہے۔ جنگ میں مرنے والے کو شہید اور بچ جانے والے لنگڑے کو غازی کہتے ہیں البتہ جس بیوی بچوں کی مستقبل کی خاطر اس نے یہ سب کچھ کیا ہوتا ہے ان کا کیا بنا، مدتوں ہوش نہیں رہتا۔

جب جنگ کی آگ بجھتی ہے تو اس کی دھویں سے کافی مدت تک انسانیت کی سانسیں گھٹتی ہیں۔ جس طرح طرفین جنگ کے بعد اپنی اپنی لاشیں ڈھونڈتی اور دفن کرتی ہیں اسی طرح جنگ کے دوران دیے گئے ماہرانہ مشینی بریفنگ، گمراہ کن تقریروں اور زہریلے پروپیگنڈے میں سچائی ڈھونڈنے والے سچائی ڈھونڈھتے ہوئے مدتوں سرگرداں رہتے ہیں۔ آیئے ہم بھی سچائی ڈھونڈنے کی تھوڑی سی کوشش کرتے ہیں۔

انڈیا نے دعویٰ کیا کہ اس کے جہازوں نے پاکستان پر حملہ کیا جس میں مقابلے پر آنے والے ایک پاکستانی ایف سولہ طیارہ بھی گرایا گیا۔ آئی ایس پی آر کے ڈائریکٹر جنرل نے پاکستانی حملے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے اس کے لئے ایف سولہ تو استعمال ہی نہیں کیے۔ ساتھ ساتھ پاکستان کے وزیراعظم نے انڈیا کے ساتھ امن اور مذاکرات کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ ہم نے صبر اس لئے کیا کہ انڈین حملے سے اپنے نقصانات کا اندازہ لگانا تھا نیز یہ کہ ہم نے کولیٹرل ڈیمیجز (عوامی نقصانات) سے بچنے کی کوشش کی ہے۔

طرفین کے بیانات کے تجزیے سے سچائی کی شکل یوں بنتی ہے کہ انڈیا نے پاکستان پر حملے کا جو دعویٰ کیا وہ سچا تھا۔ کیونکہ ہمارے وزیراعظم پاکستان کے بیان ”ہم نے کولیٹرل ڈیمیجز سے بچنے کی کوشش کی“ سے معلوم ہوتا ہے کہ حملہ کیا گیا تھا جو فوجی نوعیت کا تھا اور انڈیا نے بھی مزکورہ حملے کا مقصد فوجی انسٹالیشن ہٹ کرنا بتایا تھا۔ آئی ایس پی آر کے ڈی جی نے جواب میں انڈیا کو سرپرائز دینے اور دشمن کو احمق کہہ کر افسوس کیا تھا۔ سرپرائز یہ تھا کہ دوسرے دن پاکستانی جہاز دن کی روشنی میں انڈیا پر حملے کرنے کے لئے گئے تاکہ دیکھے جا سکیں۔ انڈین جہاز پیچھے لگے، جیسا کہ ہمارا اندازہ اور پلاننگ تھی۔ پاکستانی جہاز اپنے بارڈر کی طرف پلٹے، جیسا کہ پروگرام تھا۔ انڈین میگ جیت، بہادری، خوداعتمادی اور حماقت میں پیچھے لگے جیسا کہ انسانی نفسیات ہوتی ہے۔ پاکستانی جہاز جوں ہی اپنے بارڈر کو پار کر گئے، زمین پر

بیٹھے پاکستانی ائیر ڈیفنس کے مستعد اور ماہر نشانہ بازوں نے پلک جھپکنے میں ان کو تاکا، لاک کیا اور گرایا۔ (ایسا کارگل میں بھی کیا گیا تھا جس میں انڈیا نے تین سے پانچ جہازوں سے ہاتھ دھوئے تھے، لیکن انسان جلدی بھول جاتا ہے)۔

دو میزائل شوو کرتے ہوئے اڑے اور دو جہاز شور مچاتے ہوئے گرے۔ پہلا سیدھا پاکستانی علاقے میں منصوبے کے مطابق گرا۔ (تاکہ یوں لگے حملہ کرنے آئے تھے) دوسرا پائلٹ سمجھ تو گیا کہ پھندا لگا ہے لیکن اس کے پاس سوچنے کیلئے بس یہی ایک سیکنڈ تھا۔ ہٹ ہو کر اس نے لوپ لیا اور اپنے علاقے میں گرا، اس کی اسی ہوشیاری اور بچنے کی خواہش نے اس کی جان لے لی، ورنہ سیدھا آتا تو آج ابھے نیندن کی طرح ہماری چائے انجوائے کر رہا ہوتا۔ پورا آپریشن جس نے بھی کوریوگراف کیا تھا۔ انڈین کوریوگرافر فرخ خان کو اس سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہی سرپرائز تھا۔ زبردست، مکمل، نتیجہ خیز اور مہلک۔

ڈی جی آئی ایس پی آر نے دشمن کی حماقت کا ذکر کیا تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بالاکوٹ والا حملہ ڈرائی رن تھا جو ہماری انڈرسٹینڈنگ کے ساتھ۔ کیا گیا تھا، کیونکہ ہمارے وزیراعظم نے نریندر مودی کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا کہ پھر جنگ نہ میرے ہاتھ میں ہوگی نہ تمہارے، جس سے پولیٹیکل ڈائلاگ کیلئے محدود حملے کی بات سمجھ میں آتی ہے، جس کی وجہ سے پاکستانی ائرفورس اور ائیر ڈیفنس "سویا ہوا" تھا۔ لیکن واپس جاکر ہندوستانی اخبارات، ڈیجیٹل میڈیا، آرمی اور سیاستدانوں نے جو استہزا ابھرا لہجہ اور رویہ اختیار کیا، اس کی وجہ سے قومی پریشر، اندرونی طعنوں، اور گرم خون والے ہاکز نے پاکستانی جواب کو ناگزیر اور دشمن کو ہوش میں لانے کے لئے سرپرائز سے بھرپور بنا دینا تھا۔ خود کردہ را علاج نیست!

لگتا ہے پاکستان کی طرح انڈیا میں بھی افسروں کے بچے افسر بنتے ہیں۔ جس کی وجہ سے کہیں نہ کہیں سیلیکشن اور ٹریننگ کی معیار پر سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ابھے نیندن وردھمان سے پہلے پینسٹھ کی جنگ میں بھی ایک انڈین پائلٹ گرا تھا اور وہ بھی کسی انڈین ائیر مارشل کا بیٹا تھا۔ جس کو ایوب خان نے اپنے ساتھ چائے پلانے کے بعد اسی طرح جلدی میں بخیر و عافیت واپس انڈیا بھیج دیا تھا اور یہ بھی ائیر مارشل کا بیٹا ہے۔ بار بار اتفاقات نہیں ہوتے،

ممکن ہے یہ بھی ائیر مارشل کا بیٹا ہونے کی وجہ سے گرا ہو۔

انڈینز کو 1965 سے لاہور میں چائے پینے کی خواہش ہے اس لیے گرے ہوئے ونگ کمانڈر ابھے نیندن ورد ھمان سے جب پوچھا گیا کہ چائے کیسی تھی ؟ تو اس نے طنزیہ اشارہ نہ سمجھتے ہوئے ایمانداری سے جواب دیا۔ زبردست۔ لاہور میں چائے پلانا دوسرا سرپرائز اور بہترین کوریوگرافی تھی۔

پی ٹی ایم، ٹی ٹی پی، حکومت اور امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورتحال

"اگر ٹی ٹی پی کے ساتھ مذاکرات میں مطلوبہ نتائج ملنے میں ناکامی ہوئی تو پاکستان کے پاس دوسرے آپشنز بھی موجود ہیں"، افغانستان سے فراغت پا کر پاکستان واپس آنے والے پاکستانی سفیر منصور علی خان کے ساتھ بات چیت میں سب سے زیادہ اہم نکتہ یہی تھا۔ اس قسم کی ملفوف دھمکی سن کر ذہن عموماً عسکری آپشن کی طرف نکل جاتا ہے، لیکن عسکری آپشن تو آخری اور ڈوابنڈ ڈائی ہوتا ہے، جو پہلے بھی کئی بار مذکورہ دہشت گردوں کے خلاف استعمال کیا گیا لیکن نتیجہ آج کے باہمی مذاکرات کی شکل میں سامنے ہے۔ ماضی میں جس کے کامیابی کے بڑے بڑے دعوے کیے گئے تھے لیکن وہ دعوے صحیح ہوتے تو آج پھر انہی دہشت گردوں کے ساتھ مذاکرات نہ کرنے پڑتے۔

انسرجنسی کو ختم کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ جس علاقے میں یہ انسرجنسی جاری ہو وہاں کے عوام کے دل جیتے جائے۔ لیکن حالت یہ ہے کہ آج تک جتنے اینٹی انسرجنسی آپریشن ہوئے ہیں ان میں دہشت گردوں کو نقصان پہنچا ہو یا نہیں لیکن وہاں کی عوام کو ناقابل تلافی نقصانات پہنچے ہیں۔ جن کی وجہ سے اس پورے عمل پر اب ان کا مزید اعتماد کرنا ناممکن ہے کیونکہ ماضی میں کیے گئے آپریشنز کی وجہ سے پیدا ہونے والے شکوے

شکایات بھی ابھی تک اسی حالت میں موجود ہیں۔اب اگر رواں مذاکرات سے گھی سیدھی طرح نہیں نکلتا تو انگلیاں ٹیڑھی کر کے گھی نکالنے کے علاوہ کیا ملٹری اپریشن کے پاس کوئی اور آپشن بھی موجود ہے؟یہی سوال ہے جس کو واضح جواب کی تلاش ہے۔ عسکری آپریشن تو ٹی ٹی پی کی خواہش اور منصوبہ ہو سکتا ہے تا کہ پختون پھر سے بے گھر ہوں اور آرمی اور پختون قبائل کے درمیان تعلقات پھر سے خراب ہو جائیں۔ تاکہ لوگ ٹی ٹی پی کے گزشتہ مظالم بھول کر ایک دفعہ پھر ان کو چھپنے کی جگہ اور حملے کرنے کی سہولیات مہیا کر دیں اور آگ و خون کا سلسلہ اسی طرح جاری رہے جس طرح ماضی میں ہو چکا ہے۔ قتل و غارتگری کے علاوہ ٹی ٹی پی کو دوسرا کوئی کام کرنا آتا ہی نہیں۔

میرے خیال میں عسکری اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ اس دفعہ ملٹری آپریشن کے علاوہ ایک دوسرا آپشن بھی موجود ہے جو نہ صرف یہ کہ یقینی کامیابی کی ضمانت ہے بلکہ اس کے نتیجے میں بحال شدہ امن پائیدار اور سماجی بنیادوں پر استوار ہو گا۔ جیسا کہ پچھلے پیراگراف میں ذکر ہوا ہے کہ انسر جنسی ہو یا کاؤنٹر انسر جنسی، دونوں کی کجامیابی کیلئے سماجی بنیادوں پر علاقائی تعاون کی موجودگی اشد ضروری ہوتا ہے۔ انسر جنسی کے خلاف کیے گئے گزشتہ آپریشنوں کے بارے میں مقامی لوگوں کی عدم شرکت کی وجہ سے ماضی کی کاروائیاں کوئی اچھا تاثر قائم نہیں کر سکیں جس کی وجہ سے دہشت گردوں کے خلاف بر سرپیکار آرمی کو مطلوبہ مقامی تعاون بھی اسی مقدار میں حاصل نہیں ہو سکا، یوں مقامی آبادی کے نقصانات کے علاوہ دو طرفہ اعتماد کا بھی شدید فقدان رہا۔ نتیجتاً انسر جنسی سے متاثرہ علاقوں میں، خود کو بے بس پا کر عوام نے منظور پشتون کی قیادت میں جنگ گریز تحریک پی ٹی ایم شروع کر دی، جس کے احتجاج اور مطالبات کا بنیادی نشانہ عسکری قیادت ہے، وجہ یہ ہے کہ اس وقت کی حکومت نے ان آپریشنوں کو اون کرنے اور وضاحت دینے کی بجائے سب کچھ آرمی کے سر تھوپ دیا۔

قبائلی علاقوں میں انسر جنسی کے خلاف آپریشنز کی وجہ سے وہاں برپا ہونے والی بربادی، ان آپریشنز کی پاداش میں بننے والے مسنگ پرسنز، برباد ہونے والی جائیدادوں کے نقصانات کا ازالہ، لشکری پالیسیاں، اور اس کے نتیجہ میں مقامی لوگوں اور ان کی جائیدادوں کو

پہنچنے والے نقصانات کا اعتراف کرنے کے مطالبات پی ٹی ایم کا بنیادی ایجنڈا ہے۔

ٹی ٹی پی کے خلاف ایک اور لاحاصل اور تباہ کن آپریشن کرنے سے زیادہ بہتر آپشن، پختون قوم پرست جماعتوں کو عموماً اور پی ٹی ایم کو خصوصاً مطلوبہ سیاسی سپیس مہیا کرنا ہے تاکہ وہ دہشت گردوں کے خلاف اپنا جنگ گریز بیانیہ اور عوام میں اپنا منشور کھلم کھلا پھیلا سکے۔ پائیدار قیام امن کے لئے عسکری قیادت اور پختون قوم پرستوں کا آنے والے دہشت گردوں کے خلاف نظریہ اور مقاصد یکساں ہیں۔ دہشتگرد ایک بار پھر قوم پرستوں سمیت پولیس اور آرمی کو ٹارگٹ کر رہے ہیں اور اپنے آپریشنل اخراجات کے لئے اغوا برائے تاوان پر پھر سے عمل پیرا ہیں اس لئے پختون قوم پرست جماعتوں کو اپنا بیانیہ عام کرنے اور پی ٹی ایم کو بلا روک ٹوک عوام تک پہنچنے کا راستہ اور سہولت دی جائے، جس کا محدود پیمانے پر گزشتہ چند ہفتوں سے مظاہرہ بھی دیکھنے میں آرہا ہے۔ اگر اس دوران پی ٹی ایم کی شکایات کا ازالہ کیا جائے اور طرفین کے درمیان اعتماد بحال ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ مستقبل میں سیکورٹی فورسز کو انٹیلیجنس بیسڈ ٹارگٹڈ آپریشنز کے لئے آئیڈیل ماحول اور عوامی تعاون میسر نہ آسکے۔

منظور پشتون کو لاہور میں انسانی حقوق فورم اور آزاد کشمیر تک رسائی دینا اور علی وزیر کو ضمانت اور ہسپتال کی سہولیات دے کر عسکری اسٹیبلشمنٹ نے دانشمندانہ اقدامات کرنے میں پہل کاری کی ہے۔ جس کا دوسری طرف سے اسی نیک نیتی پر مبنی مثبت جواب آنا چاہیے، جس نیک نیتی سے ابتداء ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ مثبت اقدامات فریقین کے درمیان اعتماد کی بحالی کے لئے فی الحال آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں لیکن بڑے سے بڑے سفر کے لئے بھی ابتداء چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر کیا جاتا ہے، اگرچہ ابھی بہت دور تک بہت تیز جانے کی ضرورت ہے، کیونکہ دہشت گرد بہت تیزی سے پختون علاقوں میں اپنا نیٹ ورک دوبارہ استوار کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

ایک پختون جتنا جنگ باز نظر اتا ہے اس سے کہیں بڑھ کر وہ مذاکرات کار اور امن پسند ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر جنگ اور ناراضگی کا خاتمہ لین دین اور افہام و تفہیم پر ہوتا ہے۔ وہ جب بھی دوران ناراضگی مطالبات پیش کرتا ہے جیسے کہ پی ٹی ایم نے پیش کیے ہیں تو

اس کا مطلب جنگ کا نیوتا نہیں امن کی خواہش ہوتی ہے۔ اپنی کم عمری کے باوجود منظور پشتون کوئی عام سیاستدان نہیں بلکہ ایک دوراندیش سیاسی مدبر ہے۔ بلاشبہ اس کی پہلی ترجیح اور واحد مقصد جنگ زدہ پختون علاقے میں پائیدار امن کی بحالی ہے۔ اس لیے ان کا اعتماد حاصل کرکے عسکری قیادت وہ کامیابیاں حاصل کر سکتی ہیں جو وقت کی ضرورت اور نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ ایک دفعہ قوم اور فوج مل کر باہمی اتفاق اور اعتماد کے ساتھ جنگ پسند قوتوں کے خلاف کھڑی ہو گئی تو مغربی بارڈر ہمیشہ کے لئے محفوظ، بیرونی ہاتھ کا قلعہ قمع اور امن کی بحالی حقیقت بن سکتی ہے۔ مطالبات منظور ہونے اور سیاسی سپیس ملنے کی صورت میں قوم پرست جماعتوں کو عموماً اور پی ٹی ایم کو خصوصاً اس صورتحال سے بچنا ہو گا جس میں اپنی حکومت کے دوران اے این پی گرفتار ہو گئی تھی۔ لڑنا مارنا اور مرنا سیکورٹی فورسز کے فرائض منصبی ہیں۔ کسی سیاسی جماعت کو خود کو خالی ہاتھ عسکری قوت سمجھنا دانشمندی نہیں ہوتی، اس کا پہلے بھی پختون عوام اور لیڈرشپ بھاری قیمت ادا کر چکی ہے۔

انسر جنسی کے خلاف فوج کو آخری آپشن کے طور پر بالکل اسی طرح بلایا جاتا ہے جس طرح شہر میں آگ لگنے کی صورت میں فائر بریگیڈ کو بلایا جاتا ہے۔ آگ بجھانے کے بعد فائر بریگیڈ اپنی سٹیشن پر چلی جاتی ہے اور آگ بجھانے کے دوران جو عمومی نقصانات ہو جاتے ہیں، حکومت اس کی تلافی کر کے بحالی کے کام میں لگ جاتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں وضاحتیں اور جوابی بیانات دینا بھی آرمی نے اپنے ذمے لیا ہوا ہے۔ اگر آرمی کی ایکشن، بحالی کے پروگرام اور وضاحتوں کے کام کو سول حکومت اون کرے تو متاثرہ لوگوں اور آرمی کے درمیان تعلقات بہت تیزی سے بہتر ہو سکتے ہیں لیکن آرمی ایکشن کو ماضی میں مسلم لیگ نون نے اور نہ ہی پی ٹی آئی نے اون کیا۔ دوسری طرف اے این پی نے خود کو بلٹ پروف سمجھ کر بارودی جیکٹوں کے سامنے اپنے سینے کھولنے کی پالیسی اپنا کر ثالث بننے کی بجائے ٹرمینیٹر بننے کی غیر دانشمندانہ پالیسی اپنانے کی وجہ سے ناقابل تلافی نقصان اٹھایا۔

امن کو پائیدار موقع دینے کا اس سے زیادہ سازگار ماحول نہیں ہو سکتا۔ طرفین کو ماضی کو دفن کر کے دہشت گردوں کے مسئلے کو ہمیشہ کے لئے حل کرنے کے بارے میں

آگے بڑھنا ہو گا۔ مذہبی شدت پسندی کا آزمودہ علاج کرنے کیلئے سیکولر سیاسی جماعتوں کو ان کا مطلوبہ مقام اور سپیس دینا اشد ضروری ہے۔ امید ہے پختونوں کے وسیع تر مفاد میں دوسری قوم پرست جماعتوں کی طرح منظور پشتون بھی ملنے والی حالیہ توجہ اور گڈول کو اہم جان کر باہمی اعتماد سازی کی خاطر اپنے الفاظ کی سچائی کا ثبوت دیں گے، کیونکہ وہ اکثر اپنی تقریروں اور انٹرویوز میں کہتے رہتے ہیں کہ مسائل کے حل اور بامقصد مذاکرات کے لئے میں ہر وقت تیار ہوں، اس مقصد کے حصول کے لئے کوئی میری طرف ایک قدم بڑھائے گا تو میں دس قدم بڑھاوں گا۔

وہ دس لاکھ کون تھے؟

آزادی کی جشن کی خوشیوں بھرا اگست کا مہینہ، برصغیر کے باشندوں کے لئے تباہ کن تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس مہینے میں دس سے بیس لاکھ بے گناہ لوگ اپنے ہم وطنوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ اگر ایک مردے کی لمبائی ساڑھے پانچ فٹ مان لی جائے، اور یہ ساری لاشیں لمبائی میں زمین پر ایک دوسری کے آگے بچھائی جائیں، تو ان کی کل لمبائی تین ہزار ایک سو پچیس میل یا تقریباً پانچ ہزار انتیس کلومیٹر بنتی ہے۔ جبکہ پشاور سے افغانستان، وہاں سے ایران، وہاں سے عراق، اور پھر عراق سے سعودی عرب کا فاصلہ چار ہزار دو سو بارہ کلومیٹر بنتا ہے۔ یعنی پھر بھی اسلام آباد سے کراچی جتنا اور فاصلہ متذکرہ فاصلے کے ساتھ جمع کر کے پانچ ہزار انتیس کلومیٹر کا فاصلہ بنے گا۔ آزادی کی خوشی میں ہمارے آباؤاجداد نے اتنے لوگ مارے تھے کہ برصغیر لاشوں سے اٹ گیا تھا۔ اور یہ دس لاکھ لاشیں ایک فگر نہیں، ان میں ہر ایک، الگ الگ، اپنی ذات میں ایک کائنات تھی۔ ان کے ماں باپ، بہن بھائی، بچے اور بیویاں تھیں۔ یہ لوگ کس نے کیوں مارے؟ اس کی عجیب و غریب توجیحات پیش کیجاتی ہیں۔

سب سے زیادہ بے بنیاد اور بودی دلیل قربانی والی ہے، جبکہ یہ لوگ آزادی کی خاطر کوئی جنگ لڑنے میدان جنگ میں نہیں اترے تھے، یہ تو عام لوگ تھے۔ جن کو سیاسی نزاکتوں اور تقسیم کے بدلے میں نازل ہونے والی آفتوں کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ جن کو ان

خطرات کا اندازہ تھا وہ سپیشل ٹرینوں اور چارٹرڈ طیاروں کے زریعے بخیر وعافیت اپنے اپنے ممالک میں اتر کر وہاں کے حکومتی کرتا دھر تا بن گئے۔

بر صغیر کے باشندوں یعنی مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں نے اپنی ایک لاکھ سے زیادہ بہنوں، ماؤں بیٹیوں اور اپنی ہم وطن عورتوں کو اغوا کیا، ان کی عصمت دری کی اور چکلوں میں بیچا۔ اگر ایک عورت کو کھڑا ہونے کے لئے تین فٹ کی جگہ چاہیے تو ایک لاکھ عورتوں کو کھڑا ہونے کے لئے تقریبا دو سو پچھتر کلو میٹر لمبی جگہ ہونی چاہیے۔ جو پشاور سے کچھ کلو میٹر کے فرق سے جہلم تک کا فاصلہ بنتا ہے۔ تصور کریں اپنی وحشت کا۔ پشاور سے جہلم تک عصمت دریدہ، فروخت شدہ، اغواشدہ، بے گناہ عورتوں کی ایک قطار کھڑی ہے۔، جن کے کپڑے پھٹے ہوئے، سینے کٹے ہوئے، گلے نُچے ہوئے، چہرے کھرونچے ہوئے، جسم کھدیڑے ہوئے، رانوں پر خون بہتا ہوا، آنکھیں پتھرائی ہوئیں، بال بکھرے ہوئے اور سر دوپٹوں کے بغیر، اور دوسری طرف بر صغیر کے فاتح مرد، ہر ایک سورما، ہر ایک مجاہد، ہر ایک عورت پر ہاتھ نہ اٹھانے والا، ہر ایک اپنی مردانگی پر فخر کرنے والا اور عورت کو کمزور سمجھنے والا۔ اس سارے فساد میں کسی ایک ہندو سکھ یا مسلم عورت یا عورتوں نے مل کر کسی بھی مرد یا بچے کو ریپ نہیں کیا۔ جنسی جذبات اور وحشت کے ہیجان ان کے پاس بھی تھے۔ فسادات میں حصہ لینے والے ہمیشہ بزدل مرد ہوتے ہیں، جو منہ پر صافہ ڈال کر کمزور عورتوں پر اپنی مردانگی کا دھاک بٹھاتے ہوئے، اپنی مسلی ہوئی شخصیت کا اظہار کرتے ہیں۔ نامردوں کی مردانگی پر بر صغیر کا یہ دور ایک انمٹ بہت بڑا کالا بد صورت دھبا ہے۔

ڈیڑھ کروڑ ہندو سکھ مسلمان اور دوسرے لوگ، اپنے ملک میں بے گھر ہو کر پناہ کی تلاش میں، اپنے علاقوں سے نامعلوم علاقوں میں، جان و عزت بچانے کی خاطر نکلے۔ اگر ایک بس میں چالیس سواریاں بیٹھ کر سفر کر سکتی ہوں تو ڈیڑھ کروڑ مسافروں کے لئے سینتیس لاکھ پچاس ہزار بسیں درکار تھیں۔ یہ بسیں بیک وقت اکٹھی کرنا اور سڑکوں پر رکھنا ممکن ہی نہیں، نہ اتنی بسوں اور مسافروں کو سڑکوں پر سنبھالنا ممکن ہے۔ میری کوشش کے باوجود دنیا میں موجود ساری بسوں کی تعداد معلوم نہ ہو سکی۔

آج انڈیا میں گورنمنٹ اور نجی کمپنیوں کی بسوں کی کل تعداد تقریباً انیس لاکھ ہے۔ جبکہ پاکستان میں سن دوہزار سولہ کے ڈیٹا کے مطابق رجسٹرڈ بسوں کی کل تعداد دو لاکھ چھبیس ہزار تھی۔ یہ ڈیڑھ کروڑ لوگ چار مہینے کے دورانیہ میں اپنے اپنے گھروں سے نکلے۔ جن کا بڑا ریلا اگست کے گرم ترین اور سخت ترین حبس زدہ دنوں میں کھلے اسمان تلے کھلے میدان میں تھا، پھر رمضان کا مہینہ اور اوپر سے برسات دل کھول کر برس رہی تھی جس کی وجہ سے راستے پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ندی نالوں میں طغیانی تھی یوں صرف سڑک سفر کرنے کے قابل تھے۔ اکثریت پیدل محوسفر تھی جو پینتالیس پینتالیس میل لمبی قطاروں میں، زندگی کا بوجھ کھینچتی، دہلتے دلوں کے ساتھ، نامعلوم سفر پر رواں تھیں۔ صرف پینتالیس میل لمبی ایک قطار کے، لٹے پٹے قافلے کو کتنے کھانے اور پانی کی ضرورت تھی؟ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ برسات کی وجہ سے شارٹ کٹ اور مقامی خفیہ راستے زیر آب تھے۔ جس کی بنا پر مجبوراً ہر کوئی سڑک پر تھا اور سڑک وحشی مسلمانوں سکھوں اور ہندوؤں کے نشانے پر تھی۔

کسی کو بھی یاد نہیں تھا کہ وہ خود انسان ہے۔ اور جس کو وہ مارنے لوٹنے جارہا ہے وہ کمزور، بے سہارا، مسافر ہیں۔ جنہوں نے ان کو کبھی کوئی نقصان، کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تھی، بلکہ وہ ان کو جانتے بھی نہیں تھے۔ بس مذہب کا مختلف ہونا سب سے بڑا جرم تھا اور اس جرم کی سزا دینا سب سے بڑا ثواب اور پُنّے کا کام تھا جبکہ مرنے اور مارنے والے سب ہم نسل تھے۔ مجھے عجیب سا محسوس ہوتا ہے کہ جب کوئی ہندو، سکھ یا مسلمان دوسرے مذہب کی کسی بے گناہ لڑکی کو اٹھا کر گھر لے آتا تھا تو گھر میں موجود اپنی ماں بہن یا بیٹی کا سامنے کس طرح کرتا تھا؟ اس کی ماں، بہن، بیٹی اسے شاباش دیتی یا مزاحمت کرتی تھی؟ کسی ماں کو اپنے بیٹے کی، بیوی کو اپنے شوہر، بیٹی کو اپنے باپ اور بہن کو اپنے بھائی کے ریپ کرنے کی کہانی معلوم ہو جاتی تو اس کا رویہ اپنے باپ بیٹے بھائی اور شوہر کے ساتھ کیسا ہوتا؟ اس کو تھپکی دیتی یا نفرت کرتی؟ کوشش کے باوجود تقسیم کے وقت کے فسادات میں مسیحیوں کے ساتھ ہونے والے ظلم کے بارے میں ڈیٹا یا معلومات نہیں مل سکیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ

ہندوستان میں موجود انگریزوں کی طرح مسیحی بھی فسادات کے دوران محفوظ رہے۔ انگریز تو شکل وشان سے ظاہر تھا اپنے حفاظتی گارڈز کے ساتھ نکلتا اور حفاظتی گارڈز کے درمیان رہتا۔ البتہ مسیحیوں کی زندگی کی تحفظ کے لئے تانگے اور کار پر نمایاں طور پر اویزاں صلیب کی ایک نشان کافی سمجھی جاتی تھی، جس سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ فسادی اتنے پاگل بھی نہیں تھے، جتنا سمجھا جاتا ہے۔ صلیب کی نشان زدہ سواریوں کی وجہ سے بہت سارے دوسرے مذاہب کے لوگ بھی صلیب کے سائے میں اپنی زندگیاں بچا گئیں۔

ہماری تاریخ کی کتابیں کانگریس اور مسلم لیگ کی لیڈرشپ کو جتنا پوجیں، جتنا بڑا اور کامیاب ثابت کرنے کی کوشش کریں، ڈیڑھ کروڑ لوگوں کی دربدری، دس لاکھ سے زیادہ لوگوں کی قتل عام اور لاکھوں بے گناہ عورتوں کی عصمت دری ان کے اصل مقام کا تعین کرتی ہے۔ ان کو اس کا اندازہ نہیں تھا، یا وہ تیار نہیں تھے، یا یہ سب کچھ ان کے توقعات اور منصوبے کے مطابق تھا۔ اس پر تاریخ کا فیصلہ ابھی وقت کی عدالت میں زیر سماعت ہے اور وقت بڑا بے رحم اور غیر جانبدار منصف ہے۔

تقسیم ہندوستان میں تخلیق کردہ اس المیئے میں سب سے زیادہ نمایاں کردار انگریز کا ہے۔ جن کے ہاتھ میں تقسیم کے وقت پوری ریاستی طاقت، مشینری، فوج اور پولیس تھی۔ ہندوستانیوں کے دلوں میں اگر ایک دوسروں کے لئے صرف نفرت اور انتقام موجزن تھا تو انگریزوں کے سینے میں دل ہی نہیں تھا۔ ورنہ ساری دنیا پر حکومت کی فخر کرنے والی قوم کی موجودگی میں، ان کی مرضی کے بغیر ایسے انسانیت سوز مظالم ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ ویسے بھی یہ عجیب آزادی اور تقسیم تھی، جس کا اعلان چودہ اگست کو ہونا تھا، لیکن سترہ اگست تک تقسیم ہونے والے ممالک اور باشندے جانتے ہی نہیں تھے کہ ان کا ملک کہاں سے شروع ہو کر کہاں پر ختم ہو جاتا ہے؟ بلکہ وہ سترہ اگست تک جانتے ہی نہیں تھے کہ وہ کس ملک کے کے باشندے ہیں اور کس ملک میں ہیں؟ اس افراتفری کو، تخلیق کردہ تاریخ میں، عظیم جدوجہد اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے المیئے کو جشن آزادی کا دن سمجا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج کا دونوں ممالک میں سرکاری طور پر ان لوگوں کی یاد میں گزارنا چاہیے جو

نامعلوم لوگوں کے ہاتھوں تاریک راہوں میں مارے گئے ہیں۔ آج مشترکہ خونی بارڈر کے دونوں طرف کے لوگوں کے اجتماعی توبہ اور معافی مانگنے کا دن ہے، اس روز چالیس کروڑ غلامی سے آزاد ہوئے اور دس لاکھ سانس اور عزت سے لیکن وہ کون تھے آج کوئی نہیں جانتا۔

انڈین پائلٹ وی آئی پی تھا، اس لئے چھوڑ دیا

کام کرنے والے کو ہمارے ہاں کمی کہتے ہیں اور نکمے کو چوہدری۔ اسلام آباد کے ایک حصے کو ایمبیسیڈر انکلیو کہتے ہیں (جہاں ساری دنیا کے چوہدری رہتے ہیں) اس کے ساتھ وی آئی پی سیکٹرز ہیں، جہاں ہمارے چوہدری رہائش پذیر ہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ اسلام آباد میں صرف وی آئی پی یعنی چوہدری رہتے ہیں۔ گھروں، کاروں اور باتھ روموں کی صفائی ستھرائی (ہمارے ہاں صفائی کرنے والے کو گندہ اور گند پھیلانے والے کو صفائی پسند کہتے ہیں) کے لئے، خوبصورت باغیچے لگانے، قسم قسم کے بنگلوں اور کوٹھیوں کو رنگنے، کتے ٹہلانے، بچے کھلانے، کھانے پکانے اور کھلانے، بچوں کو پڑھانے اور یہاں کے مکینوں کی حفاظت کرنے والے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کے دل اسلام آباد میں نہیں لگتے نہ یہ خود کو اسلام آباد والے سمجھتے ہیں۔ یہ دانہ چگنے والے پرندوں کی طرح مالکوں سے بچے ہوئے یا چرائے ہوئے کھانے اور ان کے استعمال شدہ کپڑے ملی ہوئی تنخواہوں سمیت جلد از جلد وہاں جانا چاہتے ہیں، جہاں ان کے گھونسلے ہیں، جن میں بھوکے بچے منہ کھولے ٹوٹے ہوئے کواڑ کے پیچھے پردہ اٹھنے اور ماں باپ کے چہرے دیکھنے کے منتظر ہوتے ہیں۔ چھوٹے گھر اور بڑے کنبوں کے یہ عام لوگ یو آئی پی ہوتے ہیں۔ یعنی ان ائڈینٹیفائڈ پرسنز۔ بے شناخت لوگ۔ جس طرح اسلام آباد ہمارا چوہدری ہے، اسی طرح ہم کمی کمین۔ اگر آپ اسے مذاق سمجھتے ہیں تو اطلاع دیتا ہوں کہ وی آئی پی لوگوں کی قبرستان بھ یو آئی پی لوگوں کی قبرستان سے

اسلام اباد کے الگ حصے اور درجے میں ہے۔ اگر آپ وی آئی پی قبرستان کو نہیں جانتے تو نشانی یہ ہے کہ وہاں سالوں بھی کوئی فاتحہ پڑھنے نہیں آتا، کیونکہ ان کے پسماندگان مصروف ہوتے ہیں یا ملک سے باہر۔

وی آئی پی اور یو ائی پی کا تصور سب سے پہلے کس نے دیا اپنی کم علمی کی بناء پر یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن ارسطو اور افلاطون کے مثالی شہروں نظریوں اور ریاستوں میں بھی مالک اور غلام موجود تھے۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم آخری سانسوں میں دردمند دل کے ساتھ غلاموں کے حقوق کی ہدایت فرماتے فرماتے دنیا سے تشریف لے جاتے ہیں، کارل مارکس نے اسی طبقاتی نظام اور انسانی درجہ بندی پر، انسان دوستی پر مبنی نظام کا بنیادی ڈھانچہ استوار کیا ہے۔

ایک چھوٹے سے گاؤں سے لے کر جدید ترین معاشرے میں آباد ترقی یافتہ شہر تک ہر جگہ یہ نظام پایا جاتا ہے یہاں تک کہ آخرت میں بھی یہی نظام ہو گا۔ کیونکہ جنت اور دوزخ بھی الگ الگ معیار اور سائیز کے ہوں گے۔ مساوات ریاضی کی کتاب میں موجود نشان (=) کے علاوہ حقیقت میں کہیں نہیں۔ یہاں تک کہ موت یعنی جنگ میں بھی وی آئی پی آبادیوں اور تنصیبات کی حفاظت کے لئے ممکنہ حد تک حفاظتی انتظام موجود اور مستعد ہوتا ہے اور غیر اہم لوگوں کی بستیاں اور گرد آلود شہر موت کی شکار گاہ بنے ہوتے ہیں۔ جنگ تو نہیں لیکن ہم حالت جنگ میں ضرور ہیں۔ جنگ اور حالت جنگ میں بس اعلان جنگ کا فرق ہوتا ہے۔ ہندوستان کے جہاز دوسری دفعہ حملہ کرنے آئے تو ایک حملہ آور جہاز کو گرا گیا اور پائیلٹ زندہ گرفتار ہوا۔ جو بڑی بڑی جاندار مونچھوں کا مالک ونگ کمانڈر ابھے نیندن وردھمان مہاویر نکلا۔ ایک ریٹائرڈ انڈین ایئر مارشل جناب وردھمان صاحب کا سپوتر۔ اس کے جہاز میں ہمارے شہروں پر گرانے کے لئے مہلک اور تباہ کن بم تھے۔ ہمارے اہم تنصیبات کو اڑانے اور قیمتی جہازوں کو گرانے کے لئے میزائل تھے، وہ بے شک موت بانٹنے آیا تھا۔ یمراج تھا پورہ یمراج۔ وہ رنگے ہاتھوں اور خون آلود ناک کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔ ہم نے قیدی کے ساتھ انسانیت والا سلوک کیا جس کو آج وزیر اعظم صاحب نے خیر سگالی کے جذبے کے تحت واپس

کرنے کا اعلان کیا۔

بین الا قوامی جنگی قوانین کے تحت جنگی قیدیوں کو بہت سارے حقوق حاصل ہیں۔ جن میں قیدیوں کا باہمی تبادلہ اور رہائی شامل ہے۔ لیکن یہ خوش قسمت پائلٹ اگرچہ رہا ہونے جارہا ہے لیکن قانونی طور پر اتنا بد نصیب ہے کہ اس پر جنگی قیدیوں والا قانون لاگو ہی نہیں ہوتا تھا کیونکہ جنگ شروع ہی نہیں ہوئی۔ اعلان جنگ ہوئی ہی نہیں تو جنگی قیدی کیسا اور جینیوا کنونشن کون سا؟

جنرل اسد درانی نے اپنی متنازعہ اور مشہور کتاب دی سپائی کرانیکل میں لکھا ہے کہ بمبئی تاج ہوٹل والے حملوں کے دوران اس کا بیٹا بھارت میں تھا اور اس کے سفری کاغذات نامکمل تھے۔ جس کی وجہ سے وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو کر گرفتار ہو سکتا تھا۔ بیٹے نے جنرل صاحب کو صورتحال سے آگاہ کیا۔ جنرل صاحب نے ایک ہم منصب بھارتی جنرل کو فون کیا اور بھارتی جنرل نے جنرل درانی کے بیٹے کی مدد کر کے بھارت سے بحفاظت نکال لیا۔ 1965 کی جنگ میں بھی ابھے نیندن کی طرح ایک بھارتی پائیلٹ جہاز گرنے کے بعد گرفتار ہوا تھا اور خوش قسمتی سے وہ بھی بھارتی ایئر چیف کا بیٹا تھا۔ خود صدر ایوب خان کے ساتھ چائے پینے کی شرف سے سرفراز ہوا اور چند دن کے بعد ماما پاپا کے پاس بھیجا گیا۔

یو ائی پی لوگ اپنے گندے بیٹے کے لئے چین کا بنا ہوا کھلونا جہاز خرید کر دیتے ہیں اور گلی میں کھیلنے بھیجتے ہیں۔ وی آئی پی لوگ اپنے ڈیئر سن کو حقیقی جہاز مہلک اسلحے سمیت دیتے ہیں اور ہمسایہ ملک پر بمباری کے لئے بھیجتے ہیں۔ لیکن کی فکر کوئی بات نہیں، ہمسایے چائے پلا کر اسے واپس بھیج دیتے ہیں۔ کیونکہ بچے تو سب کے ہوتے ہیں۔ کیا ہمارے بچے نہیں؟ یا وہ فوج میں افسر اور پائلیٹ نہیں ہیں؟

دوسری طرف یو آئی پی لوگوں کے بے نام اور بے شناخت مقبول حسینوں کو عشروں تک تعذیب خانوں میں اذیت پسندوں کے حوالے کیے جاتے ہیں۔ ہڈیاں توڑی جاتی ہیں۔ ناخن نکالے جاتے ہیں۔ زبانیں کاٹی جاتی ہیں۔ اور جب وہ اپنے اور دشمن میں فرق کرنے کے قابل نہیں رہتے تو واپس بھیج دیے جاتے ہیں تاکہ سند رہے۔ دوسری طرف بے حیثیت

کلبھوشنوں کو شیشے کے مرتبان میں اچار کی طرح، بوڑھی ماں اور بے بس بیوی کے سامنے سجا کر تماشا بنایا جاتا ہے تاکہ وہ بھی سند رہے۔ یہی حالت مزدوری کی تلاش میں نکل کر انڈین خفیہ ایجنٹوں کی جال میں پھنسنے والے کرنل حبیب کی ہے۔ جو رزق کی تلاش میں اندھیرے تہہ خانوں کے سیلن زدہ ماحول میں کسی زنگ شدہ زنجیر کی طرح پڑا کراہ رہا ہوگا۔ لیکن اس کے بچوں کے علاوہ کوئی اس کا نام لیوا نہیں۔ کیونکہ وہ یو آئی پی تھا۔ جی ہاں! یو آئی پی نہ ہوتا تو مزدوری کے لئے نیپال جاتا؟

کلبھوشن بھی بغیر ویزے اور دو نمبر پاسپورٹ پر پاکستان آیا تھا تو ابھے نیندن کونسا ویزہ اور پاسپورٹ لے کر آیا تھا۔ غلطی سے سمندری حدود کراس کرنے والا مچھیرا اور مویشی چرانے والا چرواہا بھی عدالتی نظام کا سامنا کرتا ہے اور مقررہ قید کاٹ کر جاتا ہے۔ پھر اسلحہ اور بارود سمیت پکڑا جانے والا ابھے نیندن کیوں نہیں؟ کیونکہ وہ وی آئی پی ہے اور وی آئی پی کا بیٹا ہے کم ازکم جنگ تو برابری کے سطح پر لڑنی چاہیے، ممالک اور قوموں کی جنگ کو طبقاتی جنگ نہ بنائی جائے۔

ریاست کی زبان اور ہماری زبانیں

ہندوستان کے اردو دان طبقے کو گلہ ہے کہ تحریک پاکستان سے ہندوستان میں اردو زبان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے جبکہ یہی صورتحال اردو کی وجہ سے پاکستان کے اپنی زبانوں کی بھی ہے۔ اردو زبان اپنے نام کے ساتھ ساتھ اپنے اکثر الفاظ کے لیے بھی ارد گرد کی زبانوں کی مقروض ہے۔ اس کے علاوہ اردو زبان کے عجائبات میں سے ایک یہ ہے کہ پنجابی زبان بولنے والوں کو پنجابی، سندھی بولنے والوں کو سندھی، بلوچی بولنے والوں کو بلوچ اور پشتو بولنے والوں کو پشتون کہتے ہیں، لیکن اردو بولنے والوں کو کچھ بھی نہیں کہتے۔ اسی طرح بلوچی بولنے والوں کی ثقافت کو بلوچ ثقافت، پنجابی بولنے والوں کی ثقافت کو پنجابی ثقافت، پشتو بولنے والوں کی ثقافت کو پشتون ثقافت کہتے ہیں، تو اردو بولنے والوں کی ثقافت کو کیا کہتے ہیں؟

مغل دربار کی زبان فارسی تھی اس لئے یہی زبان نہ صرف یہ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی علم و فن، قانون اور تعلیم کی زبان ٹھہری بلکہ دوسری محکوم اقوام بھی اپنی ترقی اور مالکوں سے رابطے کے لیے فارسی زبان سیکھنے پر مجبور ہوئیں۔ دوسرے مسلمانوں کی طرح ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی ہے کیونکہ اس میں قرآن کریم اور باقی سارے بنیادی مذہبی احکامات موجود ہیں۔ جب مغل صرف نام کے حکمران رہ گئے تو ان کو ڈر پیدا ہوا کہ اگر کسی ہندوستانی زبان کو ان کے سیاسی اور انتظامی ضعف کے دور میں ترقی ملی تو اس زبان کے بولنے والے زبان کی عصبیت کی بناء پر منظم ہو کر ان سے ہندوستان چھین لیں گے، اس

لئے انہوں نے ایک لاوارث اور نئی زبان کو گود لے لیا تاکہ مستقبل میں یہ ان کی حکومت کی رابطے کی زبان ہو لیکن اس کا کوئی والی وارث نہ ہو، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ قومیں زبان کی عصبیت کی بنیاد پر بنتی اور مضبوط ہوتی ہیں۔

ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کی کسی قوم کی زبان کی سرکاری سرپرستی دراصل اسی قوم کی سرپرستی ہو گی جو آگے جا کر سیاسی مسائل کا سبب بنے گی۔ اس دور میں اردو کی کوئی مخصوص ہئیت یا نام تک نہیں تھا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں اپنی کتاب ”مقدمہ شعر و زباں“(شائع شدہ ہندوستان) کے صفحہ نمبر 148 پر لکھتے ہیں، ”گزشتہ صدی کے آخر تک اردو زبان کے بہت سارے نام تھے۔ امیر خسرو کے وقت سے لے کر انیسویں صدی کے خاتمے تک اس زبان کو ہندی، ہندوی، ہندوئی، زبان دھلوی، گوجری، (گجری، گرجری، بولی گجرات) دکنی، دکھنی، مورز مسلمانی، ہندوستانی، (اندوستانی، زبان ہندوستانی)، زبان اردوئے معلی، زبان اردوئے شاھی، زبان اردوئے حاورہ، شاجہاں آباد، ریختہ اور اردو کہتے تھے“

ہندوستان پر انگریز کے قبضے کے بعد اردو کا دوسرا خوش قسمتی کا دور شروع ہوا کیونکہ جو ڈر مغلوں کو تھا کہ کسی بڑی اور مستحکم ہندوستانی زبان کی سرپرستی سے ان کی سلطنت خطرے میں پڑ سکتی ہے، اسی خطرے کو مد نظر انگریز نے بھی اسی زبان کی سرپرستی جاری رکھی جو زوال پذیر مغل سلطنت نے اپنائی ہوئی تھی۔ مسعود حسین خاں کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اردو کو ہندی بھی کہا جاتا تھا، اس لئے انگریز نے بڑی ہوشیاری سے اپنے نوکروں کی زیر نگرانی اردو کو ترقی دینے کے نام پر ایک ایسا بندوبست کیا کہ اردو سے وہ الفاظ جو ہندی کے ساتھ اس کا مشترکہ اثاثہ تھے نکال باہر کیے اور اس کی جگہ اس میں عربی فارسی کے نامانوس اور ثقیل الفاظ شامل کیے اور یہی کچھ ہندی کے ساتھ بھی کیا گیا۔ اس سے بھی اردو کے زبان زد عام الفاظ نکال کر سنسکرت کے پرانے، متروک اور نامانوس الفاظ شامل کیے تاکہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں کا مشترکہ اثاثہ تقسیم سے دوچار ہو کر دو قومی نظریہ کی بنیاد رکھی جاسکے، جس کو بعد میں انگریز کے مشہور نوکر سرسید نے اپنایا۔

تحریک پاکستان کی صف اول کی لیڈر شپ کہتی رہی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی

کلچر، ثقافت، زباں، اور مذہب کو متحدہ ہندوستان میں خطرہ ہے، اس لیے ان کے لیے ایک الگ ملک کی ضرورت ہے۔ جب کہ اس لیڈرشپ کی اکثریت کا بذات خود عام ہندوستانی کلچر، زبان، لباس، اکل و شرب اور مذہبی عقائد سے برائے نام سا تعلق تھا۔ سر سید کے وقت تک اردو کا دامن شاعری کی چند کتابوں کے علاوہ قابل ذکر علمی اثاثے سے خالی تھا (آج بھی ہندوستان کے چند شاعروں کے علاوہ اردو کے بڑے شعراء، اقبال اور فیض پنجابی ہیں اور فراز پختون ہیں)۔ سر سید نے انگریزوں کی حمایت سے ایک ادارے سائینٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی تو انگریزی سے چند کتابیں اردو میں ترجمہ کرائیں تاکہ اردو دان طبقے کو علم کا چسکا لگے اور وہ فارسی اور عربی زبانوں سے، جن میں ان کا تاریخی، علمی اور قانونی اثاثہ تھا، دور ہو جائے۔ چونکہ انگریز کو اس علاقے میں ایک لمبے عرصے تک اپنا قبضہ برقرار رکھنا تھا، اس لیے اس نے مسلمانوں کو اپنی درباری، علمی، قانونی اور مذہبی زبانوں سے کاٹنا تھا، جس کے لئے اردو کو ان کے متبادل کے طور پر آگے بڑھایا۔ آہستہ آہستہ اردو رابطے کی زبان بنی۔ چونکہ اردو میں پہلے سے کوئی قابل ذکر تحقیقی یا نظریاتی مواد موجود نہیں تھا، اس لیے انگریز نے اپنی نگرانی میں اردو میں وہ کتابیں ترجمہ کرائیں جن سے ہندوستان کے مسلمانوں میں کوئی سیاسی بیداری پیدا ہو سکتی تھی نہ انگریز کے مستقبل کے منصوبوں کے لیے کوئی خطرہ بن سکتا تھا، یوں ہندی اور اردو کو الگ الگ کر کے اس نے 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کی پالیسی کی بنیاد رکھ دی۔

بنارس ہندوؤں کا مقدس شہر ہے، چونکہ مسلمانوں کی حکمرانی کے دوران، قانونی کتابیں عموماً فارسی زبان میں تھیں، کیونکہ اکثر قاضی اور وکیل مسلمان تھے، اس لئے ہندوؤں نے بھی مجبوراً فارسی سیکھی۔ لیکن جب انگریز حکمران بنے تو بنارس کے ہندوؤں نے ایک تحریک شروع کی کہ چونکہ نہ مسلمان بادشاہ، نہ قاضی، نہ وکیل رہے اور نہ ہی عدالت کی زبان فارسی ہے تو پھر ان کی عائلی قوانین کی کتابیں فارسی زبان میں کیوں ہوں، کیوں نہ ان کی اپنی زبان ہندی میں ہوں؟ اپنی عائلی قوانین کی کتابیں ہندی زبان میں منتقل کرنے کی اس تحریک کو 'ہماری کتابیں' ہندی اردو تنازعہ کا نام دیتی ہیں، جس کو آج تک سر سید کا کارنامہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے، جس کے مطابق انہوں نے مسلمانوں کے علمی تاریخی اور تہذیبی اور مذہبی

اثاثے ہندوؤں کی دست برد سے بچائے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان کے نئے مالک انگریز تھے تو ہندو کیسے ہندو اکثریت کی زبان کو دیوناگری رسم الخط میں منتقل کر کے ہندوستان کی زبان بنا سکتے تھے؟ اگر وہ اتنے طاقتور تھے تو انیس سو سینتالیس تک انگریز کو نکال باہر کیوں نہیں کر سکے؟ اور اب ہندوستان میں کون ہندوؤں کو اردو زبان تباہ کرنے سے روک رہا ہے، جب ان کا اپنا آزاد ملک ہے؟ کیا اب اردو زبان دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے؟ کیا بھارت میں ایک بھی مسلمان باقی نہیں رہا؟ ان کے علمی، ثقافتی، تہذیبی اور مذہبی اثاثے لوٹ لئے گئے؟ جب آج ہندو مالک اور حکمران ہیں اور اردو مٹا نہیں سکے تو بنارس کی تحریک سے اردو کیسے مٹتی؟ اگر اردو آج بھی اپنی اصل شکل میں موجود ہے تو پھر سر سید نے مسلمانوں کا کون سا اثاثہ بچایا؟

جب انگریز کی ہندوستان پر حکومت تھی تو وہ اپنی زبان کو ہندوستان پر مسلط کرتے یا اکثریت کی زبان ہندی کو اپنا کر مصیبت مول لیتے؟ اردو کے بارے میں پھیلائی گئی غلط بیانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اردو ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان ہے یا تھی، جس پر آج تک آنکھیں بند کر کے یقین کیا جاتا ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے اس دعویٰ کو صحیح مان لیا جائے تو پھر پاکستان میں کوئی سات فیصد مسلمان رہتے ہیں اور ترانوے فیصد غیر مسلم، کیونکہ بھارت سے آئے ہوئے سات فیصد، خود کو مہاجر کہنے والوں کی زبان اردو ہے، اور اس دعویٰ کے مطابق وہی مسلمان ہیں، پاکستان کے باقی قدیم باشندے یعنی پنجابی، سرائیکی، پختون، سندھی اور بلوچ غیر مسلم ہیں کیونکہ وہ اردو نہیں بولتے۔

انڈیا میں ایک سو تینتیس اور پاکستان میں ستائیس بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جس علاقے پر پاکستان بنا تھا وہاں پر چھپن فیصد بنگالی تھے، جو اردو کے ایک لفظ کو سمجھ سکتے تھے بول سکتے تھے نہ لکھ سکتے تھے اور بقایا پاکستانی پنجابی، سرائیکی، سندھی، بلوچ اور پشتون بھی اپنی اپنی زبانیں اور ثقافتوں کے مالک تھے۔ تو پھر کون سے مسلمانوں کی زبان اردو تھی، جن کا مذہبی، علمی اور ثقافتی سرمایہ سر سید نے بچایا تھا؟ جو خود کبھی سکول نہیں جا سکے وہ پاکستان میں ماہر تعلیم سمجھے جاتے ہیں۔

اردو سر سید کی مادری زبان تھی۔ اگر انہوں نے اس کی ترقی یا 'بچانے' کی خاطر کوشش کی ہے تو یہ ان کی زبان کا ان پر قرض تھا، جس طرح ہر فرد پر اس کی مادری زبان کا حق ہوتا ہے کہ وہ اس کی ترقی اور ترویج کے لیے خلوص نیت سے کوشش کرے اور یہی کچھ سر سید نے کیا۔ اس لئے ہمیں بھی اپنی مادری زبانوں کی ترقی اور ترویج کے لیے سر سید کی طرح آگے آنا چاہیے۔ کیونکہ زبان کی عزت اور ترقی اس کو بولنے والی قوم کی عزت اور ترقی ہوتی ہے۔ امریکہ کا مشہور دانشور نوم چومسکی کہتا ہے کہ کسی قوم کو برباد کرنا ہو تو جہازوں سے ان پر بمباری کرنے کی ضرورت نہیں صرف ان کی زبان غائب کر دیں، قوم فنا ہو جائے گی۔

جس طرح کسی اور زبان کو سیکھنے سے کوئی ہندو بنتا ہے نہ عیسائی، بلکہ دوسری زبان سیکھنا ایک بہت بڑا علمی اقدام ہے، اسی طرح نہ کوئی زبان مسلمان یا غیر مسلم ہوتی ہے نہ مقدس یا راندۂ درگاہ۔ کسی زبان میں مقدس مذہبی کتاب، مذہبی علم یا احکامات تو ہو سکتے ہیں لیکن مذہب میں زبان نہیں ہو سکتی کیونکہ اس طرح تو مذہب محدود اور ناقابل ابلاغ ہو جائے گا، جب کہ مذہب کی جان اس کے ابلاغ میں ہے۔ صرف مصر میں ڈیڑھ کروڑ قبطی عیسائی موجود ہیں جنکی مادری زبان عربی ہے۔ مشرق وسطی کے یہودیوں کی اکثریتی زبان بھی عربی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد اردو کی خوش قسمتی کا تیسرا اور پاکستانی زبانوں کی بد قسمتی کا نیا دور شروع ہوا، جس کی بناء پر ان زبانوں اور ان کے بولنے والوں کو علمی، تعلیمی اور ترویجی میدانوں میں ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ جن علاقوں میں پاکستان بنا، ان علاقوں کے باشندوں کی تحریک پاکستان میں کوئی خاص دلچسپی اور کوشش شامل نہیں تھی۔ چونکہ ان علاقوں میں ہندو کبھی بھی اکثریت میں نہیں تھے اس لیے یہاں کے باشندوں کو دو قومی نظریہ یعنی ہندو سے نفرت کوئی خاص متاثر نہیں کر سکی، نہ ان کو نظریۂ پاکستان یعنی ہندو کا ڈر، کوئی زیادہ اپیل کر سکا۔ پاکستان کی تحریک ان علاقوں میں زیادہ سرگرم رہی جو آج پاکستان کا حصہ نہیں ہیں، اس لیے کہ سندھی، پنجابی، بلوچ اور پختون اقوام ہندو کے ساتھ براہ راست کسی مذہبی یا اقتصادی مسئلے میں مقابل نہیں رہے۔

پنجابی مسلمان کا ذہنی مسئلہ بھی تقسیم کے وقت پنجابی سکھ کے ساتھ باہمی فسادات کی وجہ سے وجود میں آیا، ورنہ اس کے ذہنی رویے کی کوئی اور تاریخی توضیح پیش نہیں کرنا مشکل ہے۔ ان وجوہات کی بناء پر دو قومی نظریے کے پرچارک ہندوستان کے ان علاقوں سے تھے جہاں پر مسلمان اقلیت میں تھے، یعنی گنگا دوآب، اودھ، یوپی اور بہار کے علاقے۔ وہاں کے باشندوں کے ہندووں کے ساتھ کچھ مسائل حقیقی تھے اور کچھ تخلیق کردہ، اور انہی لوگوں کی زبان اردو تھی، برصغیر کے سارے مسلمانوں کی زبان نہیں۔ پاکستان بننے کے بعد انہی علاقوں سے کچھ لوگ مختلف وجوہات کی بنا پر مہاجر بن کر پاکستان آئے، جہاں پر ان کے ہم زباں تھے نہ سیاسی ہم خیال۔ ان مہاجرین میں مسلم لیگ کے بڑے بڑے رہنما بھی تھے جو بعد میں پاکستان کے حکمران اور مالک بنے۔ یہ تاریخ میں شاید پہلی دفعہ ہوا کہ کسی ملک کے کرتا دھرتا اس کے اصلی باشندوں کی بجائے وہاں مہاجر بن کر آنے والے بنے۔ جو اس علاقے کے باشندوں کی سیاسی حماقت یا سادگی تھی، جس کی وجہ سے ان مہاجر لیڈروں نے بڑی مدت تک اس ملک پر حکمرانی کی جہاں پر ان کی کوئی جان پہچان تھی نہ ان کو وہاں کے لوگوں نے انہیں منتخب کیا تھا اور نہ ان کو یہاں سے منتخب ہونے کی کوئی امید تھی، عموماً مہاجرین کو منتقل ہونے والے ملک میں پناہ، روزگار اور خوراک ملے تو احسان سمجھا جاتا ہے۔

دراصل یہ سیاسی اور اقتصادی مہاجرین رہنما پاکستان کی بڑی اقوام کی ایک زبان بھی نہیں جانتے تھے جبکہ یہ ان اقوام پر حکمرانی کرنے آئے تھے، بلکہ مستقبل میں بھی ان کے یہی ارادے تھے، اس لیے بجائے اس کے کہ یہ یہاں کی زبانیں سیکھتے، انہوں نے یہاں کے باشندوں کو اپنی زبان سیکھنے پر لگا دیا۔ انہوں نے یہاں کے باشندوں کو سمجھایا کہ آپ کی کلچر اور زبان ان کی کلچر اور زبان سے کم تر اور آپ کی تاریخ مجہول اور ناقابل التفات ہے اس لیے آج سے آپ کی زبان ہندوستان سے آئی ہوئی زبان اردو، آپ کی تاریخ ہندو سے ڈر اور نفرت، آپ کا کلچر گنگا اور جمنا کے کنارے اور ہندوؤں کے درمیان پنپا ہوا کلچر ہو گا اور انہوں نے مان بھی لیا۔

دنیا بھر کی اقوام زبان کی بنیاد پر بنتی اور پہچانی جاتی ہیں۔ پاکستان میں پہلے سے الگ

الگ زبان کلچر اور روایات پر مبنی اقوام اپنی قابل فخر تاریخ کے ساتھ موجود تھیں، جو مہاجرین کی زبان کلچر تاریخ اور روایات سے کسی طرح کم تر نہ ہونے کے باوجود بد ترین خسارے سے دوچار کی گئیں۔ پاکستان بنا تو بنگالی پاکستان کی سب سے بڑی زبان تھی، جس کا حق تھا کہ وہ قومی زبان بن جاتی اور آج پنجابی سب سے بڑی قوم اور سب سے بڑی زبان ہے، اس لئے قومی زبان بننے کا حق پنجابی کا ہے۔ دوسری طرف پاکستان کی علمی، دفتری اور حاکمانہ زبان انگریزی ہے جو پڑھنے والے بچے کسی نہ کسی مرحلے پر سیکھنے پر مجبور ہیں۔ زبان اور نفسیات کے ماہرین کے مطابق پرائی زبان اپنی مادری زبان میں اچھی طرح سیکھی جا سکتی ہے۔ لیکن پاکستان میں، پرائی زبان انگریزی، ایک اور پرائی زبان اردو میں سکھانے کی سعی لاحاصل جاری ہے، جس کی وجہ سے ہمارے اکثر بچے انگریزی زبان میں کمزور یا ناکام ہوتے ہیں کیونکہ بولنا لکھنا اور ترجمہ کرنا بیک وقت ممکن نہیں۔ پرائی زبان اپنی زبان میں اچھی طرح سیکھنے کا ثبوت ہے کہ اردو عموماً مادری زبانوں میں ترجمہ کر کے سکھائی جاتی ہے اس لئے اسے جلدی سیکھ لیا جاتا ہے لیکن انگریزی کو اردو میں ترجمہ کر کے سکھایا جاتا ہے جس کی وجہ سے ہماری انگریزی اسی معیار کی نہیں ہوتی۔ دوسری طرف انگریزی گرائمر کی کتاب بھی اردو جملوں کی نشانیاں بتاتی ہوئی کہتی ہے کہ جس جملے کے آخر میں تھا ہے، تھی ہے، تھے ہیں، آ جائے وہ پریزنٹ سمپل ٹینس ہے، جب کہ تھا ہے تھی ہے اردو زبان میں آسکتے ہیں، انگریزی میں نہیں۔

اردو بولنے والے اہل زبان اور نہ بولنے والے 'عجم' ہیں یوں غلط اردو بولنے پر 'عجم' کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اگر اردو واقعی پاکستان کی قومی زبان ہے تو چاہیے تھا کہ اردو زبان میں پاکستان میں موجود ہر قوم کا حصہ ہوتا۔ اس کا دامن ہر زبان کے الفاظ محاورات اور ضرب المثال کے لیے پھیلا ہوتا، اس کے گرائمر کے اصول گنگا جمنا سے آئے ہوئے مہاجرین کی مرضی سے طے نہ ہوتے بلکہ پاکستان کے قدیم باشندوں کی مرضی سے مرتب ہوتے، کوئی اہل زبان اور کوئی عجم نہ ہوتا۔ پہلے بھی اردو کے اکثر الفاظ ارد گرد کی زبانوں سے لیے گئے تھے، اب بھی سندھی، بلوچ، پشتو، پنجابی، کشمیری، سرائیکی زبانوں کے الفاظ وافر مقدار میں

اپنا کر اردو کو سب کے لئے قابل فہم اور آسان بنا دیا جا سکتا تھا۔ فارسی اور عربی جو اس علاقے کی کسی قوم کی زبان نہیں، اس کے الفاظ تو اردو میں قابل قبول ہیں، لیکن بلوچی، سندھی اور پشتو کے نا قابل قبول اور نامانوس۔

اگر ایسا نہیں ہو سکتا اور اردو محض ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجرین کی زبان ہے تو پھر یہاں پر موجود ہر قوم کی اپنی ایک زبان موجود ہے، جبکہ علمی زبان انگریزی ہے، اس لئے قوم کی تعلیمی اور علمی ترقی کی خاطر انگریزی زبان کو مکمل اپنا کر اردو کو ان کی مادری زبان کا درجہ دیا جائے جن کی وہ واقعی مادری زبان ہے۔ کیونکہ اردو کا دامن آج بھی سرسید کے دور کی طرح علمی، تحقیقی اور طبع زاد معیاری سرمایہ سے بالکل خالی ہے اور خالی دامن سے کچھ ملنے کی توقع حماقت ہوگی۔

جنوبی پختونخوا، شمالی پختونخوا اور ان کی شاملات

پختون مسئلہ نہیں, مسئلے میں گرفتار ایک مصیبت زدہ، باصلاحیت لیکن منتشر قوم ہے۔ تقسیم ہند کے وقت پنجابی بھی، پختونوں کی طرح تقسیم کر دیے گئے تھے، لیکن ان کی تقسیم واضح مذہبی فالٹ لائن، یعنی سکھ پنجابی اور مسلمان پنجابی کے اصولوں پر مبنی تھی۔ پختونوں کے درمیان اس قسم کی کوئی فالٹ لائن بھی موجود نہیں تھی لیکن پھر بھی تقسیم در تقسیم کر کے کمزور کر دینے والی عمل سے گزار کر ان کو قدرتی عدد کی بجائے کسری عدد کی شکل دے دی گئی۔

افغانستان میں پختون قوم کی موجودگی اور حالت کی بات پھر کبھی سہی، آج صرف پاکستان میں موجود پختون قوم کی بات کرتے ہیں۔ شمالی پختون (خیبر پختونخوا) جنوبی پختون (بلوچستان میں موجود پختون) مشرقی پختون (ہزارہ اور ایبٹ آباد کے پختون جن سے ملنے کے لئے پختونخوا کے لوگ پنجاب سے ہو کر گزرتے ہیں اور اس جغرافیائی نارسائی کی وجہ سے ہزارہ اور ایبٹ آباد کی پختون آبادی کی زبان، ثقافت قومی رویوں پر پنجاب کے اثرات دن بدن بڑھ رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں کہ چھچھ کے پختونوں کی طرح، جو ون یونٹ توڑنے کے بعد پنجاب کے حوالے کر دیے گئے تھے، یہ علاقے بھی اپنی زبان، ثقافت، شناخت اور باقی علاقوں کے رشتہ داروں کے لئے اجنبی بن جائیں گے) ان کے علاوہ قبائلی پختون، کراچی اور خلیجی ممالک میں رہائش پذیر پختون مایک قوم لیکن مختلف اکائیوں میں موجود ہیں۔ جن

کے خاندانی نظام، روایتی طرزِ زندگی اور ڈالے گئے مخصوص اثرات کی بناء پر، پیدا کردہ ذہنی ساخت کی وجہ سے، ان کی آبادی باقی قوموں کی مناسبت سے تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد جان بوجھ کر ان کے علاقے میں صنعتیں قائم نہیں کی گئیں۔ ان کی قابل کاشت زمینیں تھوڑی اور روزگار کے دوسرے ذرائع کم تھے، جس کی وجہ سے وہ اپنے علاقے سے دور دراز علاقوں میں روزگار کی تلاش میں منتقل ہوگئے، جس میں پختون خواہ کی اقتصادی حالت سے زیادہ وہاں کی سیاسی صورتحال ملوث دکھائی دے رہی ہے۔

انگریز کی موجودگی میں جو سامراج دشمن تحریک اس علاقے میں عبدالغفار خان کی قیادتِ میں اٹھی تھی، اس کے اثرات پاکستان بننے کے بعد بھی بہت ساری مخالفتوں کے باوجود باقی رہے اور آج تک موجود ہیں۔ آگر پختونخوا میں صنعتیں لگا دی جاتیں تو پختون روزگار کی تلاش میں دور دراز علاقوں میں جانے کی بجائے اپنے علاقے میں رہتے، خوشحال ہو جاتے تو تعلیم حاصل کرتے، تعلیم حاصل کرتے تو اس کی بنیاد پر وہ پختونخوا کی سیاست میں اپنا شعوری حصہ ڈالتے، اور یوں پختون قوم پرستی مضبوط ہو جاتی۔ پختون قوم پرستی کی مضبوطی اور قومی اتحاد کی وجہ سے مصنوعی اسلامی شجرکاری ممکن نہ ہوتی تو سرحد پار کے پختونوں کے علاوہ، شمال، جنوب اور مشرق میں منتشر پختون آبادی کے متحد ہونے کا خطرہ رہتا، اس لیے اس سیاسی خطرے کی پیش بندی کی خاطر، اقتصادی میدان میں، باوجود اس کے کہ پختون محنت کرنے میں کسی قوم سے پیچھے نہیں بلکہ اس میدان کوئی ان کا ہمسر نہیں، ان کے علاقے کو کارخانوں اور روزگار سے بنجر رکھا گیا۔ جس کی وجہ سے آج پختونوں کا بڑا حصہ پیٹ کی خاطر کراچی اور خلیج کے علاوہ پاکستان کے ہر صوبے کے ہر اہم شہر میں سڑکیں توڑتے، پہاڑ کھودتے، اینٹیں ڈھوتے، قالین کاندھے پر ڈھالے، ہاتھوں میں موبائل فون کے متعلقات لئے، کاک بورڈز کے ہوم میڈ سٹینڈز پر عینکیں سجائے، پھلوں کے ریڑے دھکیلتے، چھابڑیاں لگائے، بوٹ پالش کے ڈبے سامنے رکھے، لنڈے کی دکانیں کھولے، کباڑ کی بوریاں اٹھائے، مکئی کے دانوں کی بھٹیاں دھکائے، تسبیح کنگھیاں اور مسواک بیچتے ہوئے ملتے ہیں۔

پختونوں کو سمتوں اور علاقوں میں منتشر کرنے کے علاوہ قومی اور بین الاقوامی

کھیلوں میں بھی حصہ دار بنا کر فوائد سمیٹے کے علاوہ اندرون ملک ان کی سکونت اور ہجرتوں سے بھی اچھے نتائج حاصل کیے گئے۔ آگر ایک طرف بلوچستان میں پختون کی موجودگی بلوچ قوم اور ان کی ریاست مخالف تحریک کے مقابل قوت کے طور پر استعمال کی جارہی ہے تو دوسری طرف پختون علاقوں کی بیروزگاری اور سوات وزیرستان کی حالیہ فوجی آپریشنوں کی وجہ سے پیدا کردہ، اندرونی ہجرتوں کے ذریعے کراچی میں ایم کیو ایم کی عددی اکثریت اور جارحانہ سیاسی رویوں کا علاج کیا گیا۔ پھر نقیب اللہ کے بہیمانہ قتل کی وجہ سے کراچی میں قبائلی علاقوں سے نئے منتقل شدہ پختونوں کو ایک علیحدہ پلیٹ فارم پر متحد کر کے وہاں پر پہلے سے موجود پختونوں کی واحد اواز، اے این پی کے لئے بھی پی ٹی یم کی شکل میں ایک متبادل مسابقتی شریک کار پیدا کیا گیا۔

قبائلی علاقوں کو جن مقاصد کے لئے علحیدہ رکھا گیا تھا ان مقاصد کے ضمنی حصول، بین الاقوامی مجبوریوں اور پی ٹی ایم کے ظہور نے ان علاقون کو جلد بازی اور بغیر تیار کیے خیبر پختونخوا کا حصہ بنانا پڑا۔ جس کی وجہ سے شمال و جنوب میں موجود قوم پرست سیاسی جماعتوں کے درمیان ایک نئی کشمکش شروع ہو گئی، اور یہی کشمکش شروع کرونا اور پختون یکجہتی کو مزید دوری سے ہمکنار کرونا، قبائلی علاقوں کے ساتھ اس اچانک انضمام کے کچھ مقاصد تھے۔

پی ٹی ایم کی تحریک اندرونی مسائل کی وجہ سے اٹھی تھی۔ پختون لیڈرشپ میں کھلا ہاتھ اور حجرہ (ڈیرہ) بچھا ہوا دستر خوان اور برابری کا سلوک اچھی کوالٹی سمجھی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اضطراری حالات میں پختون، نر (بہادر) اور مظلوم کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ موخر الذکر دونوں خصوصیات ان کو منظور پشتین میں نظر آئیں اس لیے وہ اس کے ساتھ کھڑے ہوگئے اگرچہ قومی غیرت دلانے کے علاوہ، منظور پشتین کے بیانیہ میں، قبائلی علاقوں سے باہر کے پختونوں کے لئے کچھ بھی نہیں تھا، اور ایک سال گذر جانے کے باوجود آج بھی پی ٹی ایم کی اہم اور مرکزی لیڈرشپ اور مخصوص بیانیہ مخصوص علاقوں سے متعلق ہے۔ اگرچہ ان کے مطالبات اب پانچ سے گیارہ ہوگیے ہیں جس کی وجہ سے ان کے بیانیہ میں

اب علاقائیت کی بجائے قومیت کی کچھ کچھ جھلک نظر آنے لگی ہے۔ پی ٹی ایم کے اسلام آباد دھرنے میں تقریریں تو سب نے کیں، لیکن بعد میں صرف محمود خان اچکزئی کی پارٹی کے کارکن پی ٹی ایم کی تنظیم سازی، نعرہ سازی اور نعرہ بازی میں نمایاں رہے۔

اے این پی کے بر خلاف، اسٹیبلشمنٹ نے محمود خان اچکزئی کو بلوچ مجبوریوں کی بنا پر ہمیشہ سے بر داشت کیاہے جس کی وجہ سے ان کی صوبائی سیاسی پوزیشن کو زیادہ کمزور نہیں ہونے دیا جاتا۔ (مثلاً جنوبی پختونخوامیں پختون آبادی کی موجودگی کے باوجود پی ٹی آئی موجود نہیں)۔ لیکن 2018 کے الیکشن سے پہلے، اینٹی اسٹیبلشمنٹ تحریک میں نمایاں حصہ ڈالنے کی وجہ سے ان کو بھی پیچھے کر دیا گیا۔ چونکہ وہ بلوچستان کے جغرافیائی، ڈیموگرافک، بین الاقوامی اور سیاسی صورتحال میں وہ بے بدل اور بلا متبادل پوزیشن کے مالک غیر بلوچ سیاستدان ہیں، اس لئے پی ٹی ایم کو اپنے پروں میں لینے کے باوجود وہ افغانستان سے ہو کر انگلینڈ تک قومی اور بین الاقوامی ملوث کرداروں کو سمجھنے اور سمجھانے میں مصروف ہیں۔

دوسری طرف، شمال میں اسفندیار ولی خان کی قیادت میں، اے این پی ہے، جو باچا خان اور ولی خان کی وراثت اور ان کی بھاری بھرکم شخصیات کے موجودہ قیادت کے ساتھ ان کے تقابل کے وجوہات کی بناء پر مشکلات کا شکار، لیکن جہد مسلسل کی راہ پر گامزن ہے۔ جنوبی پختونخوا کی طرح یہاں بلوچ مسئلہ موجود نہیں اس لیے ریاست نے دامے درمے سخنے، ہر طریقے سے ان کو کمزور سے کمزور تر کرنے کی بھرپور کوششیں کی ہیں جس میں غداری کے سب سے زیادہ اور اعلیٰ تمغے بھی ان کے حصے میں آئے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد نئے ملک کو ایک ولن کی ضرورت تھی، سامراج دشمنی کے لئے مشہور باچاخان کی صورت میں نئے ملک کو وہ ولن میسر ہوا۔ قیوم خان جو کبھی باچاخان کے لئے رطب اللسان ہوا کرتا تھا، ان پر چھوڑا گیا۔ جس نے ملک کے ابتدائی سال میں بابڑہ کی زمین کو بے گناہ پختونوں کے خون سے سیراب کیا۔

ایوبی دور کی قید و بند اور لیاقت باغ میں پختون قتل عام بھی اے این پی کی سیاسی جدوجہد کو اپنے علاقے میں ناپید نہیں کر سکی۔ پختونخوا میں اسلامی شجرکاری اور طالبان کی

کاشت بھی اے این پی کے تناظر میں دیکھ لینی چاہیے۔ چارسدہ میں نثار محمد خان اور شیر پاؤ فیملی کا سیاسی ظہور بھی اے این پی کی سیاست کی مرہون منت ہے، نیز بلور اور میاں افتخار کے خاندانوں کے سانحات بھی اس تعلق کی بناء پر وقوع پذیر ہوئیں۔

افغانستان میں امریکی مداخلت اور موجودگی کی وجہ سے اسلامی شجرکاری سرحد کے دونوں طرف کمزور پڑ گئی تو پی ٹی آئی اس خلا کو پر کرنے کے لئے شمالی پختونخوا میں لائی گئی تاکہ اے این پی کو اسلامسٹوں کی کمزور پوزیشن کی وجہ سے الیکشن میں واک اوور نہ مل سکے۔ 2018 کے الیکشن سے قبل، اے این پی کو آغا برادران کے ذریعے جنوب فتح کرنے کا خوش نما لالی پاپ دیا گیا تھا لیکن نتائج آنے کے بعد، مولانا فضل الرحمان کی طرح، محمود خان آچکزئی کے ساتھ ساتھ اسفندیار خان بھی شدید حیرت میں مبتلا کر دیے گئے تھے، کیونکہ سیاسی بورڈ کے کرتا دھرتاؤں کو لوکل ٹورنامنٹ سے زیادہ بین الاقوامی ٹورنامنٹ کے لئے ٹیم تیار کرنے کی فکر تھی۔

سیاسی میدان میں پختونوں کے پاس پہلے سے دو علاقائی سیاسی قوم پرست جماعتیں موجود تھیں۔ اب قبائلی علاقوں کی واگذاری کے بعد اگرچہ ان علاقوں کو شمال میں ضم کیا گیا ہے تاہم اب قوم پرست سیاسی جماعتیں تین ہو گئی ہیں۔ اے این پی، پی میپ، اور پی ٹی ایم، اگرچہ پی ٹی ایم کی انتظامی، نظریاتی، تنظیمی اور پروپیگنڈا کے معاملات پی میپ نے اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں۔ جس کی بناء پر بعض اوقات اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ پی میپ اور پی ٹی ایم کہاں پر الگ اور کہاں پر یکجان ہیں اور پی ٹی ایم کا اپنا بیانیہ کیا ہے اور پی میپ کہاں کہاں ان کے بیانیہ پر اثرانداز ہو رہا ہے؟ جنوبی پختونخوا میں پی ٹی ایم کی کارکردگی اور غالب اکثریت، پی میپ کے ارکان پر مبنی اور مرہون منت ہے۔ ارمان لونی کے قتل کے بعد پی ٹی ایم کی ذہنی کشمکش اور پس و پیش بھی اس بات کو عیاں کرتا ہے کہ پی ٹی ایم کے مطالبات پس منظر میں چلے گئے اور ارمان لونی کے قتل کی ایف آئی آر سب سے اہم ایشو بن کر سامنے آیا۔ پشاور جلسہ کئی لحاظ سے سابقہ جلسوں کی بازگشت ثابت ہوا لیکن نئی بات، آئین، قانون اور عدم تشدد کی پرچارک تحریک نے آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت کا نعرہ لگا کر

کی ہے۔

پی میپ پی ٹی ایم کو اپنی بارگیننگ پوزیشن بہتر کرنے اور بلوچستان میں اپنی سابقہ پوزیشن بحال کرنے کے ساتھ ساتھ، شمالی پختونخوامیں اپنے سیاسی اثرات کو سوات، صوابی اور پشاور تک بڑھانے کے لئے کام میں لارہی ہے، نیز بین الاقوامی مارکیٹ میں فرنچائز کھولنے کے لئے بھی پی میپ پی ٹی ایم کو استعمال کرتے ہوئے کوشاں ہے۔ پی ٹی ایم کی شکل میں شمالی پختونخوامیں، میپ کے بڑھتے ہوئے اثرات کو اے این پی اپنے لیے خطرناک سمجھتی ہے، اس لیے اے این پی، پی ٹی ایم کے ساتھ مخالف جماعت کا سا سلوک روا رکھتی ہے، جس کی وجہ سے ملک کے اندر پختون یکجہتی کا راستہ لمبا ہوتا جارہاہے۔ ساتھ ساتھ اے این پی، پی ٹی ایم کی مخالفت کرکے مقتدر حلقوں سے اپنے لئے نرم گوشہ، آسانیاں، وعدے وعید اور یقین دہانیاں بھی حاصل کرنے کی امید رکھتی ہے۔ جبکہ پی ٹی ایم کو بھی اپنا بیانیہ مقبول بنانے کے لیے شمالی اور جنوبی پختونخوا کی اکثریت کی ضرورت تھی اور ہے اس لیے ان کو جس نے بھی کاندھا پیش کیا وہ سپورٹ کے لئے ادھر جھک گئی جبکہ قبائلی علاقوں کی انضمام کے وقت اپنے آپ کو غیر جانبدار رکھ کر پی ٹی ایم نے اپنے پتے مہارت سے کھیلے۔

پی ٹی ایم، اے این اپی اور پی میپ کے پاس اپنی بربادی کارونا لے کر آئی تھی مگر شمالی پختونخوا (اے این پی) اور جنوبی پختونخوا (میپ) کی قوم پرست پارٹیاں قبائلی علاقوں کو اپنی آبائی شاملات دیہہ سمجھ کر آپس میں لڑ رہی ہیں۔

دوسری طرف پی ٹی ایم کے ظہور اور بیانیہ کے بعد پھر سے بہار آئی ہے جس کی وجہ سے اسلامی شجر کاری خوب پھل پھول رہی ہے اور نئے تناور درخت نظر آنے لگے ہیں۔ پی ٹی ایم کو پارلیمنٹ تک پہنچانے کے علاوہ یوتھ آف وزیرستان کے لئے بھی مستقبل کے ڈرامے میں مضبوط اور موثر کردار لکھنے کے لئے کہنہ مشق ادیبوں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ یوتھ آف وزیرستان پر وار ویٹرن جماعت اسلامی کے شدید اثرات بتائے جاتے ہیں۔ اس لیے پیش گوئی کی جاسکتی ہے کہ مستقبل قریب میں پی ٹی ایم کو سوات، صوابی اور پشاور میں جلسے کرنے کی بجائے، یوتھ آف وزیرستان کی ٹیم کے ہاتھوں اپنے ہوم گراؤنڈ اور ہوم کراؤڈ کے بارے

میں فکر مندی کی ضرورت ہو گی۔

سیاسی اسلامی پارٹیوں کی طرح جن کا نعرہ، امت مسلمہ کی وحدت اور اسلامی نظام کا نفاذ ہے لیکن وہ ایک دوسرے کے پیچھے اللہ کے سامنے جھکنے کو بھی تیار نہیں ہوتیں، ان سہہ رنگے پختون قوم پرست جماعتوں کی بھی سمجھ آنی مشکل ہے، کیونکہ دو بڑے اور ایک چھوٹا اگر ایک ساتھ بیٹھ کر اپنے مسائل حل کر کے متحد اور متفق نہیں ہوسکتے تو گروہوں، جماعتوں، علاقوں اور سمتوں میں بکھری پختون قوم کو یہ کیسے یکجا کر کے منزل مقصود تک پہنچائیں گے۔ اب ان تینوں سے قربانی کی توقع کی جارہی ہے کیونکہ باقی قوم نے کافی صعوبتیں اٹھائی ہیں مزید امتحانات دینے کی ان میں سکت نہیں رہی۔

یہ فیصلہ مستقبل قریب میں ہونے والا ہے کہ ان تینوں میں کون کس کو استعمال کرتا ہے اور اپنے مقاصد حاصل کرتا ہے؟ یا تینوں ایک دوسرے کی پشت بانی کر کے ذاتی، اور شخصی مفادات اور اناووں سے بالاتر ہو کر صرف سیاست کرنے کی بجائے مدبرانہ قومی سوچ اپناتے ہیں۔ یاد رہے، منظور احمد پشتین اس میدان میں نئے ہیں۔ ان کو ایک تاریخی لمحے نے جنم دیا ہے۔ آیا اس نے جماعت اسلامی کی طرح دوسروں (آرمی) کو استعمال کرتے کرتے خود استعمال شدہ ہونا ہے یا شیر شاہ سوری کی طرح بہت جھنڈے، کئی گروہ، ان کے قلیل المدت اور طویل المدت مفادات، بڑے بڑے ناموں کی موجودگی کے باوجود، مختلف سمتوں میں منقسم اور منتشر پختونوں کو ایک جھنڈے، ایک پارٹی، ایک نعرہ اور ایک نصب العین پر اکٹھا کر کے جدید دنیا کے ترقی یافتہ اور روشن خیال شہری بنانے ہیں؟

محمود خان اچکزئی: افغان طالبان کا نیا وزیر خارجہ

پختون عمرانی معاہدے (پختون ولی) میں بندھی ہوئی مشترکہ زبان کی حامل مختلف نسلوں پر مبنی ایک قومی گروہ کا نام ہے اور بدل (انتقام)، دشمنی، ننواتی (جرگہ) اور صلح، دوسری اجزا کی طرح پختون ولی کا لابدی حصہ ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے اور طالبان خود بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ ماضی میں اپنی قوم اور دوسری گروہوں کے خلاف قتل مقاتلے میں ملوث رہے ہیں، جو آج بھی اپنے اس اعتراف اور عمل کے ساتھ کھڑے ہیں۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ان کے ہاتھ پختونوں کے خون سے رنگے نہیں ہیں، لیکن ہم جیسے عدم تشدد کے پرچارک ہیں کے پاس طالبان سے بدل لینے کے لئے اخلاقی اور عوامی طاقت اور پختون ولی کے اصولوں کے علاوہ کون سا متبادل راستہ اور طاقت موجود ہے؟

کیا دشمنی اور بدل کے ساتھ ننواتی اور صلح لازم و ملزوم نہیں ہوتا؟ کیا زیادتی کرنے والے کو معاف کر کے دوست بنانا اعلیٰ اخلاقی قدر نہیں رہی؟ کیا کوئی لڑائی کسی لڑائی نے ختم کی ہے یا حجرے اور جرگے میں بیٹھ کر لڑائیاں ختم کی جاتی ہیں؟ ہزاروں سالوں پر مشتمل ایسی کوئی تاریخی شہادت بھی میسر نہیں ہے کہ کبھی کسی لڑائی میں سارے مرد ختم ہوگئے ہوں اور فریقین کی عورتوں نے جرگے میں بیٹھ کر آپس میں صلح کر دیا ہو؟ دشمنی اور صلح، قتل مقاتلے اور امن و معافی سب مرد کرتے ہیں، مرد کرتے آئے ہیں، کیونکہ مرد خود مختار ہوتے ہیں، وہ اپنی نسل کی بہتر مستقبل کی خاطر ماضی کو بھلانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

طالبان اقلیت پر مشتمل ایک غیر جمہوری گروہ ہے، جن کی طاقت عوامی مرضی پر مشتمل نہیں ہے لیکن اشرف غنی نے جن قوتوں کے ساتھ شراکت اقتدار کر کے حکومت حاصل کی تھی وہ قوتیں بھی تو بندوق کی طاقت پر بھروسا کرتی تھیں۔ آپ خود سوچیں کہ جب اشرف غنی کی تین لاکھ فوج اور جدید بارودی طاقت طالبان کا سامنا میدان جنگ میں کر سکی تو آپ اپنی تقریروں سے کیسے ان سے اختیار یا امن واپس لے سکتے ہیں؟ طالبان جنگ اور بدامنی کے ماہر ہیں اور آپ امن اور آشتی کے طلبگار، دونوں کا اس میدان میں کوئی مقابلہ نہیں۔

طالبان جن قوتوں نے پیدا کیے تھے ان کے اور مولانا فضل الرحمان کے مقاصد یکساں ہیں۔ دونوں کا مقصد پختون علاقوں اور ذہنوں سے قوم پرستی کو دیس نکالا دینا ہے۔ طارق جمیل اینڈ کمپنی انہی لائن پر کام کرنے والی ان کی ایک اور اختصاصی جماعت ہے۔ آپ کو وقتی طور پر صحیح لگے تو مولانا کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر جلسہ جلوس مزاحمت اور انتخابی اتحاد کر لیتے ہیں اس وقت آپ یہ نہیں سوچتے کہ پروڈکٹ جس کی بھی تھی لیکن انڈے اور انہیں سینے کے لئے پولٹری فارمز مولانا نے مہیا کیے تھے اور وہی ہیں جو اشرف غنی جیسی حالت بنانے کی دھمکی بھی دیتا ہے۔ یعنی جب محدود وقتی مقاصد کے حصول کے لئے آپ شہد کی مکھیوں کی ملکہ کے ساتھ ہاتھ ملانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں تو پھر یہ بھی نہ سوچیں کہ وہ شہد کی مکھیاں کون ہیں؟ یا ان کو لانے والا کون تھے؟ وہ گذرے ہوئے کل کی بات تھی، آج اگر طالبان اپنی پالیسیوں کی وجہ سے ہر قسم کی حمایت سے محروم ہو گئے ہیں تو آپ کے لئے آگے بڑھ کر ان کے ساتھ بات چیت کرنے اور وسیع تر پختون بہبود کی خاطر ان کو دوست بنانے کے علاوہ کون سی آپشن موجود ہے؟ آپ کی تقریریں ان کو اقتدار سے الگ نہیں کر سکتی ہیں لیکن آپ کی ہم خیال لوگوں کو ان کا شریک اقتدار کر سکتی ہیں۔ ماضی میں مولانا فضل الرحمان، نواز شریف اور ایم کیو بھی آپ کے ساتھ شریک اقتدار رہی ہیں اور عبد الولی خان مرحوم نے کئی بار حکمت یار کو حمایت دینے کی آفر کی تھی بشرطیکہ وہ امریکی جہاد چھوڑ کر پختون کاز کے لئے تیار ہو۔ ٹھوس شواہد کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ امریکہ اور اس کے زیر اثر

پاکستان نے طالبان کو سپورٹ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ایک بڑی پالیسی شفٹ ایک بار پھر ظہور پذیر ہونے والی ہے۔ جس کی وجہ سے افغانستان اور پاکستان کے پختون علاقے ایک بار پھر بدامنی سے دوچار ہونے والے ہیں۔ افغانستان میں رجیم چینج کے بعد پاکستان میں افغان طالبان کے ہمدرد ایک بار پھر اسی قسم کی صورتحال پیدا کرنے کی کوشش کریں گے جس طرح ماضی میں دیکھنے میں آئی تھی۔ کیا آپ ایک بار پھر خالی جسموں کے ساتھ بندوق و بارود کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں؟ وگرنہ لڑنے مرنے کا کام تو سیکورٹی فورسز کا ہے۔ پچھلی دفعہ تو حکومت دے کر آپ کو ٹریپ کر دیا گیا تھا لیکن اس دفعہ پھر اس قسم کی صورتحال میں پھنسنے کے بعد میں اسے آپ کی سیاسی سٹریٹیجی کا حصہ سمجھنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔

سرحد پار تبدیلی ہونی ہے لیکن اس تبدیلی کے دو متبادل راستے ہیں۔ پہلا راستہ یہ ہے کہ جو گرینڈ جرگہ بلایا گیا تھا اس کے ممبران کو لے جا کر افغانستان میں طالبان سے بات چیت کی جائے، آخر پاکستان نے بھی ٹی ٹی پی کے ساتھ یہی کیا ہے اور اب بھی کوششیں جاری ہیں۔ جرگہ مشران طالبان کو پختون قوم کی بہبود اور امن کے نام پر قائل کریں کہ وہ شدت پسندی ترک کر کے جمہوریت، بین الاقوامی قوانین اور پختون ولی کے تحت ہمہ شمول حکومت قائم کر کے افغانستان کو مستقل بنیادوں پر ترقی کے راستے پر ڈالیں تو آپ اور آپ کے ہم خیال ان کی حمایت کریں گے، جس کی وجہ سے افغانستان افغان اور پختون مزید بربادی سے بچ جائیں گے اور پائیدار امن کے لئے راستہ ہموار ہو جائے گا یا پھر وہ امریکی جنگ باز حکمت عملی کا سامنا کرتے ہوئے علاقے خطے اور خصوصی طور پر پختونوں کو ایک بار پھر اور یا شاید آخری بار جنگ کا ایندھن بناتے ہوئے افغانستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی سازش میں شرکت کرے۔

پہلا راستہ جو امن کا ہے وہ محمود خان اچکزئی نے اپنایا ہوا ہے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر مشترکہ حکمت عملی اپنائیں۔ اگر طالبان پختون بننے پر تیار ہوں، ماضی کا راستہ ترک کرنے اور اپنے کیے پر شرمندہ ہوں، آپس میں بھائی چارہ قائم کرنے میں دلچسپی رکھتے ہوں، افغانستان اور ڈیورنڈ لائن کے دونوں طرف موجود پختون علاقوں میں امن قائم کرنے کے خواہشمند

ہوں، تو دوستی کا ہاتھ بڑھانے اور پختون ولی کی اعلی اقدار قائم کرنے میں دیر نہ کریں۔ کیونکہ پختونخوا کی امن افغانستان کی امن سے منسلک ہے اور آپ امن اور عدم تشدد کے پرچارک ہیں۔ امن مانگنے سے نہیں ملتا امن کے لئے ٹھوس اقدامات کرنے پڑتے ہیں اور ٹھوس اقدامات پرانی دشمنیاں ختم کر کے آنے والی نسلوں کے لئے بہترین ماحول پیدا کرنے کا موقع ضائع نہ کرنے کا نام ہے۔

علی وزیر، محسن داوڑ، منظور پشتین اور ان کی کشمکش

اگرچہ کسی ایک جلسے کی بنیاد پر کسی سیاسی جماعت کی شہرت اور مستقبل کے بارے میں پیشگوئی نہیں کی جاسکتی لیکن 'عمرانی سیاست' کو معیار بناتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ رزمک کے حالیہ جلسے نے محسن داوڑ کی پارٹی این ڈی ایم کا رنگ مزید پھیکا کر دیا۔ جب سے این ڈی ایم بنی ہے تب سے میں محسن داوڑ اور پی ٹی ایم کے درمیان جاری کشمکش کو غور سے دیکھ رہا ہوں، لیکن ابھی تک محسن داوڑ کے ہاتھوں پی ٹی ایم میں کوئی بڑی ڈینٹ ڈلتے ہوئے نہیں دیکھا۔

وزیرستان کے تین اہم قبائل کی نمائندگی کرتے ہوئے، علی وزیر، محسن داوڑ اور منظور محسود، برابری کی سطح پر تین رکنی جرگہ ممبران کی طرح سیاست کے میدان میں سامنے آئے تھے۔ ان کا بیانیہ اپنی اپنی قوم کی طرف سے قبائلی علاقوں میں جاری بدامنی اور شورش کے خلاف امن اور انصاف کا تقاضا تھا۔ علی ابھی تک وزیر، محسن ابھی تک داوڑ ہے لیکن منظور نے اپنی قبائلی پہچان محسود کو چھوڑ کر پشتین کی پہچان اپنائی، کیونکہ اس کو احساس ہو گیا کہ بدامنی اور ناانصافی صرف قبائل کا نہیں تمام پختون قوم کا ہے۔

اس نے پورے پاکستان میں کئی کامیاب جلسے کر کے علاقے میں پہلے سے موجود سیاسی اور مذہبی جماعتوں کو عدم استحکام کا شکار کیا۔ جن علاقوں کو چھوٹی بڑی طاقتوں نے میدان جنگ میں تبدیل کر دیا تھا وہاں پر جنگ مخالف مظاہرے شروع ہوئے تو پہلے سے موجود پختون قوم پرست جماعتوں کو بھی پہلی بار میدان ہاتھ سے نکلتے ہوئے محسوس ہوا۔

جنوب میں پی میپ اور شمال میں اے این پی کو لگا کہ ان کا ووٹر پی ٹی ایم کے بیانیے میں زیادہ دلچسپی لینے کی وجہ سے ان کا بیانیہ پی ٹی ایم کے سامنے پھیکا پڑنے لگا ہے۔

جس علاقے سے پی ٹی ایم کا ظہور ہوا تھا وہ پہلے صرف مولوی کا چراگاہ سمجھا جاتا تھا۔ جمیعت کو اپنی جنگ پسند پالیسیوں کی وجہ سے جنگ بیزاروں نے رد کرنا شروع کیا تو جماعت اسلامی کو آگے کیا گیا۔ اس لیے جو لوگ اسمبلی کے فلور پر جماعت اسلامی کے سینیٹر مشتاق احمد کو پختون کاز کے لئے توانا آواز سمجھتے ہیں کہ وہ محسن داوڑ کے ساتھ آواز ملا کر پختون کاز کے لئے بول رہا ہے وہ غلطی پر ہیں۔ ایسا ہوتا تو سینیٹر مشتاق پنجاب میں جماعت اسلامی کی طرف سے پختون سٹوڈنٹس پر ہونے والے تشدد کے خلاف کیوں نہیں بولتا یا ان کو منع کیوں نہیں کرتا؟ غلط فہمی کے شکار ان حضرات کے لئے عرض ہے کہ محسن جماعت اسلامی کے ساتھ ملا ہوا ہے سینیٹر مشتاق، محسن داوڑ کے ساتھ نہیں۔ جس طرح بلوچستان میں مولانا ہدایت اللہ بلوچوں کے ساتھ ہے اسی طرح سینیٹر مشتاق پختونوں کے ساتھ ہے۔ جماعت اسلامی کو تاریخی پس منظر میں رکھ کر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ محسن داوڑ نے اپنی جماعت بنا کر پی ٹی ایم کو تقسیم کر دیا ہے جس کے کئی وجوہات ہیں۔ بظاہر تو یہ تقسیم پالیسی معاملات پر ہوئی ہے، کیونکہ محسن سمجھتا ہے کہ اسمبلی میں جا کر اپنے علاقے کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک موثر آواز کی ضرورت ہے، جبکہ منظور پشتین اسمبلیوں میں دوسری قوم پرست جماعتوں کی سالہا سال سے موجودگی کی مثال دے کر کہتا ہے کہ انہوں نے وہاں رہ کر ابھی تک کیا کیا ہے؟

چونکہ محسن کی تربیت این جی اوز کے لائن پر ہوئی ہے اس لئے وہ جز وقتی فوائد کو طویل المدت مقاصد کے حصول کے لئے زاد راہ سمجھتا ہے، لیکن منظور پشتین کی نظر میں جز وقتی اور قلیل المدتی فوائد کی کوئی وقعت نہیں۔ اس نے عدم تشدد پر مبنی مستقل مزاحمت کا راستہ چنا ہے جو باچا خان کی سٹریٹیجی ہو کر بھی منظور پشتون کا طریقہ نہیں ہے کیونکہ باچ خان نے پاکستان بننے کے بعد پختونوں کو ان کے آئینی حقوق دلوانے کے لئے عدم تشدد کا راستہ اپنایا جبکہ تقسیم ہند سے پہلے عدم تشدد آزادی کے حصول کا ذریعہ تھا۔

منظور پشتین سمجھتا ہے کہ عدم تشدد اور پارلیمانی سیاست دونوں ساتھ نہیں چل سکتے۔ پارلیمنٹ میں جانے اور چند سیٹیں جیتنے کی خاطر اس کو بہت کمپرومائز کرنے پڑیں گے۔ کیونکہ پاکستان میں الیکشن میں خاطر خواہ کامیابیاں حاصل کرنے کے لئے ووٹروں کی اکثریت سے زیادہ ایسٹیبلشمنٹ کی قربت اور منظوری زیادہ اہم ہوتی ہے۔ وہ اگر ایک دفعہ اس دلدل میں اترا تو پھر واپسی ناممکن ہو جائے گی۔ اس لئے وہ اسمبلی اور وہاں کی محدود شہد لگی سیاست سے الگ رہ کر اپنی تحریک کو کسی بھی سمجھوتے سے الگ اور آزاد رکھنا چاہتا ہے جس میں وہ ابھی تک کامیاب ہوتا نظر آیا ہے۔

محسن داوڑ نے اپنی نئی پارٹی بنانے کے لئے علی وزیر سے مشاورت کی یا نہیں، مجھے نہیں پتہ، لیکن اس نے علی وزیر کی جیل سے رہائی اور وزیرستان میں واپسی کا انتظار نہ کر کے مجھے یہ حق دیا ہے کہ میں اس کی اس جلد بازی کا تجزیہ کروں۔

سوال بنتا ہے کہ آخر محسن داوڑ کو کیا جلدی تھی کہ اس نے علی وزیر کا انتظار نہیں کیا اور اس کی غیر موجودگی میں منظور پشتین سے راستے الگ کر کے نئی پارٹی بنانے کا اعلان کر دیا؟ کیا اسے ڈر تھا کہ علی وزیر واپس آئے گا تو وہ نئی پارٹی بنانے کی مخالفت کرے گا جس کی وجہ سے اس کو ملی ہوئی پذیرائی مزید کم ہو جائے گی؟ یا اسے کسی طرح معلوم تھا کہ علی وزیر کا انتظار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اسے بڑی دیر تک اندر رکھے جانے کا پروگرام ہے؟ یا وہ سمجھتا تھا کہ علی وزیر جیل سے نکل کر منظور پشتین کے ساتھ کھڑا ہو گا اور یوں وہ نئی پارٹی بنانے کے قابل نہیں ہو گا۔

محسن کی نیشنل ڈیموکریٹک موومنٹ میں تقریباً سارے پرانے پختون نیشنلسٹ سوشلسٹ اور کمیونسٹ شامل ہیں۔ میرا اندازہ تھا کہ این ڈی ایم کی وجہ سے میپ یا اے این پی کو کوئی بڑا کٹ نہیں لگے گا نقصان ہو گا تو پی ٹی ایم کا ہو گا، لیکن حال ہی میں رزمک میں منعقدہ جلسے میں حاضرین کی کم تعداد دیکھ کر میرا یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہوا۔ این ڈی ایم کے اہم ممبران جیسے افراسیاب خٹک صاحب بشرہ گوہر یا پروفیسر اسماعیل انتخابی سیاست کے میدان کے شیر نہیں۔

پروفیسر اسماعیل کے علاوہ جتنے بھی پرانے سیاستدان اس کے ساتھ ہیں وہ اپنی سابقہ پارٹیوں کی وجہ سے سینیٹر بنے تھے۔ وہ اچھے پارلیمنٹیرینز ہیں اور انٹلیکچوئل ہیں، لیکن وہ ووٹروں کو متاثر کرنے والے سیاستدان نہیں ہیں، اس لیے ان کا کچھ بھی داؤ پر لگا ہوا نہیں ہے۔ پروفیسر اسماعیل جیل سے رہا ہو کر گھر آئے، ان کی صاحب زادی گلالئی اسماعیل امریکہ میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہی ہے، کیونکہ گلالئی اسماعیل بھی محسن داوڑ کی طرح پاکستان سے زیادہ عالمی فورمز پر شہرت کی مالک ہے، تبھی تو ماضی قریب میں دونوں کو بین الاقوامی انسانی حقوق کے ادارے نے اعزازات سے نوازا۔

این ڈی ایم کے وجود میں آنے کے بعد پی ٹی ایم کے جذباتی کارکن کنفیوژن کے شکار ہیں۔ محسن داوڑ چونکہ ان کی تحریک کا ساتھی تھا اس لیے وہ ابھی تک انہیں اپنا ساتھی اور رہنما سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ کنفیوژن میں سوشل میڈیا پر لکھتے ہیں کہ ووٹ محسن کو دیں گے اور سپورٹ پی ٹی ایم کو دیں گے۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ محسن نے این ڈی ایم بنا کر منظور پشتین کا ساتھ اور پی ٹی ایم کا بیانیہ نہ صرف یہ کہ چھوڑ دیا ہے بلکہ اس کو چیلنج اور رد کر دیا ہے۔ محسن داوڑ کی نئی پارٹی کی جان، وزیرستان کی حد تک، اسی میں ہے، کہ وہ ہر فورم پر منظور کے 'مزاحمت اور پارلیمنٹ سے باروبار' والی پالیسی کی مخالفت کرے۔ ورنہ پھر وہ منظور سے الگ کیوں ہوا ہے؟ اگر اس کے مقاصد اور بیانیہ وہی ہے جو پی ٹی ایم کا ہے تو پھر اس نے الگ پارٹی بنانے کا خواب کیوں دیکھا؟ وہ پہلے بھی پی ٹی ایم کی شہرت استعمال کر کے راج سنگھاسن تک پہنچا ہے اور آئندہ بھی یہی کر سکتا تھا۔ وہ پی ٹی ایم کی مخالفت نہیں کرے گا تو الیکشن کہاں سے لڑے گا؟ ساتھی کہاں سے بنائے گا؟ ہجوم کیسے پیچھے لگائے گا؟ کیونکہ اس کی پارٹی کا پاور بیس وہی وزیرستان ہے، جہاں پر پی ٹی ایم کے کنفیوز کارکن یہ سمجھتے ہیں کہ این ڈی ایم کو ووٹ بھی دیا جا سکتا ہے اور پی ٹی ایم کا ساتھ بھی دیا جا سکتا ہے۔ لیکن مستقبل میں یہ فالٹ لائن اتنی گہری ہوتی جائے گی کہ وہاں کے ووٹروں کے لئے فیصلہ کرنا آسان ہو جائے گا۔ فی الحال رزمک کا ناکام جلسہ اور پی ٹی ایم کے سٹیج پر محسن داوڑ کی غیر موجودگی اس بڑھتی ہوئی خلیج کی طرف کافی واضح نشانیاں ہیں۔ حال ہی میں گلستان میں تقریر کرتے ہوئے پختونخوا ملی عوامی

پارٹی کے رہبر محمود خان اچکزئی نے بھی اس سلسلے میں اپنی پارٹی کارکنان کو واضح الفاظ میں حکم دیا کہ دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ ہمارے وقتی اتحاد ہوں گے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ان کے جلسوں میں شرکت کریں یا ان کی لیڈرشپ کو گھر بلا کر دعوتیں کھلائیں۔ آپ نے پختونخوا ملی عوامی پارٹی کا کارکن بننا ہو گا یا دوسری جماعتوں کا۔

میری نظر میں ان کے دھمکی آمیز ہدایات اپنی پارٹی کے ان کارکنان کے لئے تھیں جو حال ہی میں سابقہ سینیٹر مرحوم عثمان کاکڑ کے اس جلسے میں شرکت کے لئے گئے تھے جو پی ٹی ایم کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔ لگتا ہے محمود خان اچکزئی کو بھی پی ٹی ایم کی طرف سے اپنی پارٹی میں تقسیم کے خطرے کا سامنا ہے، کیونکہ ایک وقت تھا جب پی میپ پی ٹی ایم کی مہمان نوازی میں پیش پیش تھی۔ شاید ان کا خیال تھا کہ وہ اپنے علاقے میں پی ٹی ایم کے بیانیے کی شہرت کو اپنی پارٹی کے لئے کیش کر سکیں گے، لیکن پی ٹی ایم نے سخت جان ثابت ہو کر محمود خان اچکزئی کو مایوس اور خوفزدہ کر دیا ہے۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ پی ٹی ایم کی مین لیڈرشپ پورے پاکستان میں آنے جانے میں آزاد تھی لیکن بلوچستان میں ان کو جانے سے منع کیا جاتا تھا، میرا خیال ہے ان پر یہ پابندی ابھی تک برقرار ہے۔ کیا اس کے پیچھے بھی پختونخوا ملی عوامی پارٹی کی غیر علانیہ رضامندی شامل تھی؟

ٹی ٹی پی کی قبائلی علاقوں میں واپسی، افغانستان میں ظہور پذیر ہونے والا نیا عالمی بندوبست، پختونخوا کے چند علاقوں میں پولیس اور اے این پی کے کارکنان پر پھر سے ہونے والے جان لیوا حملے، این ڈی ایم، پی ٹی ایم، محسن داوڑ، علی وزیر اور منظور احمد پشتین کو ایک دفعہ پھر اہم کھلاڑیوں کی حیثیت دینے والے ہیں۔

گندہ پنجابی اور پراجیکٹ پٹھان

نسل پرستی، نفرت پر پلنے والی بیمار ذہنیت کا بدبودار اظہار یہ ہے۔ اپنی قوم کے لئے بہتری، برابری اور خوشحالی مانگنا اور اس کے لئے کوشش کرنا قوم پرستی ہے جس کی بنیاد پر یہ ملک بنا ہے۔ لیکن اپنے آپ کو اپنے کسی ظاہری وجہ یا تصوراتی خوبی کی بنا پر دوسروں سے برتر سمجھنا اور دوسری قوم کو تمسخر، استہزا اور نفرت کا نشانہ بنانا، اس کی تاریخ، روایات اور طرز زندگی کو مسخ کر کے پیش کرنا، اور محض اس لئے کہ وہ آپ سے مختلف ہے، کسی بھی سطح پر اس کا استحصال کرنا، نسل پرستی ہے۔

چند دنوں پہلے محسن داوڑ کی کسی تقریر سے "گندہ پنجابی" اخذ کر کے اچھے خاصے دانشور دوستوں نے جواب در جواب کا ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ میں محسن داوڑ کا وکیل صفائی نہیں لیکن بہت کوشش کے باوجود بھی میں مذکورہ تقریر کو ڈھونڈھ نہیں سکا جس میں مبینہ طور پر محسن نے مذکورہ الفاظ ادا کئے تھے۔ اس کے علاوہ اپنے تین دانشور پنجابی بلاگرز دوستوں اور دو یوٹیوبروں سے مذکورہ تقریر کے لنک بھی مانگے لیکن کوئی لنک ملا نہ جواب۔ صرف ایک دوست نے بتایا کہ اس نے پوسٹ کہیں سے کاپی کی تھی، لنک تلاش کے باوجود جب ان الفاظ کی تصدیق نہیں ہو سکی تو پوسٹ ڈیلیٹ کر دی۔

اگر محسن داوڑ نے واقعی ایسے الفاظ استعمال کیے ہوتے تو قابل مذمت تھے۔ (اب تو اس نے تردید بھی کر دی) یہ بھی سچ ہے کہ ماضی میں ان کے جلسوں میں کچھ نسل پرستانہ

نعرے لگتے تھے لیکن اب سننے میں نہیں آ رہے ہیں۔ جن کی میں نے ہمیشہ مذمت کی ہے۔

گذشتہ دنوں اسلام آباد میں منعقدہ ایک احتجاجی مظاہرے میں، بڑی مدت کے بعد، پختون اور پنجابی تعلیم یافتہ نوجوانوں نے مل کر انسانی حقوق، آئین اور قانون کی بالادستی کے لئے ایک ساتھ آواز اٹھائی۔ جس کی پاداش میں پولیس نے بلا تفریق پختون اور پنجابی مظاہرین پکڑ کر ان پر غداری کے مقدمات قائم کیے، جس کو اسلام آباد ہائی کورٹ نے بعد میں قانون کے کوڑے دان میں ڈال دیا۔

ریاست کے کارپردازوں کی انگریزی حکمت عملی یعنی لڑاؤ اور حکومت کرو، ابھی تک تبدیل نہیں ہوئی جس کی وجہ سے وطن عزیز میں مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کی بجائے خلیج بڑھائی جارہی ہے۔ ایک صوبہ دوسرے کو غدار اور دوسرا پہلے کو غاصب کہتا ہے۔ اور یوں، تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں۔

جس احتجاجی مظاہرے میں پختونخوا کے محسن داوڑ کے ساتھ پنجاب کے حبیب جالب، عاصمہ جہانگیر اور فیض گرفتار ہوئے تھے، اسی مظاہرے کے بارے میں دیے گئے ایک وضاحتی بیان سے ایسے نسل پرستانہ الفاظ نکالنا سامری کا کمال ہے جس کو سوشل میڈیا کے غیر سوشل حلقوں کے ذریعے دم بھر میں پھیلا دیا گیا۔ پولیس کانسٹیبل نے دوران ڈیوٹی، مذہبی اور سیاسی نعرہ بازی کر کے پولیس قواعد کی خلاف ورزی کی، لیکن اس سے پوچھ گچھ کرنے کی بجائے عوامی نمائندے سے پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔

ایک ایسے مظاہرے میں، جس میں پنجاب کے بیٹوں پر پختونوں کے لئے آواز اٹھانے کی پاداش میں غداری کے تہمت لگے، جس کی وجہ سے پختونوں اور پنجابیوں کے درمیان موجود تعصبات کا سمندر ایک لمحے میں پاٹا گیا، باشعور پنجابی نوجوانوں نے پختونوں کی خاطر غداری کے تمغے فخر سے سینوں پر سجا کر نفرت انگیز پروپیگنڈے کے ابولہول کو ایک ضرب خلیلی سے تہس نہس کیا، تو اس یکجہتی اور بھائی چارے سے نسل پرست پروپیگنڈے کا نعرہ برامد کر کے نفرت کی توپیں سرحد پر نصب کی گئیں۔ یقین کریں انسانی حقوق، آئین اور قانون کی بالادستی کے لئے آواز اٹھانے والے پنجابیوں کی تعداد جتنی بڑھے گی، پاکستان اتنا ہی

مضبوط ہو گا۔

"گندہ پنجابی" کے الفاظ جتنے گندے ہیں، پاکستانی ڈراموں اور فلموں میں دکھایا جانے والا، نسوار تھوکنے والا، بندروں جیسی حرکات کرنے والا، غلط سلط اردو بولنے والا اور پرائی کوٹھیوں کی چوکیداری کرنے والا پختون کا کردار تخلیق کرنا بھی اتنا ہی گندہ ہے۔ "گندہ پنجابی" ایک فرضی پروپیگنڈہ کہانی تھی جو مجھ سمیت سب کو بری لگی تو پوری پختون قوم کو نسوار کی نشئی، چوکیدار اور دہشت گرد بنا کر پیش کرنا کسی کو برا نہیں لگتا؟ کیا نسل پرستی کچھ اور ہوتی ہے؟

میں نے زندگی بھر پشتو زبان کی فلم یا ڈرامے میں پنجابی قوم، کلچر یا زبان کی تضحیک نہیں دیکھی۔ پشتو زبان کی کلاسیک فلم جوار گر، طاقتور طبقے کے ستائے ہوئے انسانوں کی کہانی ہے۔ جو پولیس کے ڈر سے مفرور ہو کر ایک غار میں رہنے والوں کی کہانی پر مبنی ہیں۔ ایک ساتھی باقی ساتھیوں کی تعارف اپنے سرادر سے کراتے ہوئے ایک ہاتھ سے معذور ایک مفرور کے بارے میں کہتا ہے، کہ "یہ بہت بہادر اور غیرت مند پنجابی نوجوان ہے۔ دشمن کی ظلم سے تنگ آکر ہمارے پاس آیا ہے"۔ جسے فلم کے اختتام پر بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ بھارت کی فلم کا نام "مائی نیم از خان آئی ایم ناٹ اے ٹیررسٹ" ہوتا ہے لیکن دوسری طرف پاکستانی فلم میں پختون ٹیررسٹ ہوتا ہے۔ پاکستان میں پختون اور سکھ کو مختلف اظہاریوں کے ذریعے عموماً تمسخر کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اوّل الذکر کے ساتھ نسلی تعصب اور آخر الذکر کے ساتھ محض مذہبی بنیاد پر ایسا کیا جاتا ہے۔ جبکہ سکھ خود بھی نسلاً پنجابی ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمان پنجابی تو عقلمند ہو اور سکھ پنجابی بیوقوف ہو؟

کچھ لوگ ملک کی مختلف اقوام کے درمیان بھائی چارے اور ہم آہنگی کے علاوہ، چوالیس اعشاریہ سات فیصد پنجابیوں (وکیپیڈیا) کی زبان اور چودہ فیصد پختونوں کی شناخت کو بھی اس ملک کے لئے خطرہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے پوری کوشش کرتے ہیں کہ پنجابیوں کی زبان اور پختونوں کی شناخت کو مختلف طریقوں سے ختم کر دے۔ پنجابی زبان کو کن طریقوں سے نابود کیا جا رہا ہے اس کے لئے ایک الگ کالم کی ضرورت ہے۔ البتہ پختونوں کی شناخت مٹانے

کے بارے میں یہاں مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

لفظ پختون اور پشتون میں فرق صرف پشاوری اور قندھاری تلفظ میں پشتو لفظ (ﮋ) کی ادائیگی کا مسئلہ ہے۔ ورنہ دونوں الفاظ ہم معنی اور صحیح ہیں۔ پختون ایک وقت میں پورے برصغیر کے باشندے، بادشاہ اور اختیار مند تھے، صرف افغانستان یا آج کی طرح پختونخوا تک محدود نہیں تھے، جو انگریزوں، فرانسیسیوں، ولندیزیوں اور ہسپانویوں کی طرح اپنے علاقوں سے نکل کر سلطنتوں کے مالک بنے۔ اس دوران جب یہ وسطی اور جنوبی ہندوستان میں پہنچے تو انہوں نے اپنی پہچان، پختون کے اسم جمع پختانہ کے نام سے کروائی۔ ان علاقوں کے باشندے حرف 'خ' کا تلفظ حرف 'ک' سے تبدیل کرتے ہیں۔ جو آج بھی ہندی فلموں میں خدا کی بجائے کھدا اور خود بخود کی بجائے کھود بکھود سنائی دیتا ہے۔ اس لیے ان لوگوں نے پختانہ لفظ کا تلفظ اپنے مخصوص لہجے میں پکھتانہ کرنا شروع کیا۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ ک، حذف ہونے کی وجہ سے پتھانہ پتھان اور پھر انگریزی اثرات کی وجہ سے پٹھان بولا اور لکھا جانے لگا۔

انگریز نے ہندوستان سے متصل پختونوں کا علاقہ قبضہ کرنے کے بعد، اس علاقے کے باشندوں کو نئی شناخت دینے اور اپنی قوم، قبیلے اور ماضی سے کاٹنے کی غرض سے غلط العام اور دشمن کے دیے ہوئے نام پٹھان کو ایک منصوبے کے تحت کتب اخبارات اور سرکاری طور پر مشہور اور مقبول بنانے پر توجہ دی۔ پاکستان بن جانے کے بعد سرکاری پیسوں سے پختون دشمن انگریز افسر اولف کیرو، سے مخصوص مقاصد کے تحت ایک نیم تاریخی کتاب لکھوائی گئی اس کا نام اسی پٹھان پروجیکٹ کے تحت 'دی پٹھان' رکھا گیا۔ اس کتاب کے مصنف اور سرکاری منطق کے مطابق پاکستان میں رہنے والے پختون پٹھان ہیں، جبکہ بارڈر کے پار رہنے والے افغان ہیں۔ یہی پٹھان نام اب اتنا زبان زد عام ہو گیا ہے کہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ پختون بھی خود کو پٹھان کہلواتے ہیں۔ تعلیم اور شعور کی کمی کی وجہ سے پختونخوا سے باہر بہت کم پختون خود کو پختون کا نام دیتے ہیں۔ جبکہ دوسری اقوام میں لفظ پٹھان ایک برائی سمجھی جاتی ہے۔ جبکہ درحقیقت لفظ پٹھان، افریقی امریکیوں کو سفید فام امریکیوں کی طرف سے نفرت کے اظہار کے طور پر کہا جانے والے نام nigger کے برابر حقارت آمیز (derogatory)

نام ہے، جو اب پختونوں نے بھی کم علمی کی بنا پر اپنایا ہوا ہے۔ اگر پختون بلوچ کو بلوچ سندھی کو سندھی اور پنجابی کو پنجابی کہتے ہیں تو پختون کو بھی اس کے قومی، ذاتی، عزت والے نام سے پکارا جانا چاہیے۔ جب بھی کسی شخص کو اہمیت نہیں دی جاتی یا توہین کرنا مقصود ہو تو اس کو اپنی مرضی کا نام دیا جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے پختون کسی مخصوص سال میں مارکیٹ میں آنے والی گاڑی ہے جیسے کرولا، ایکس ایل آئی، یعنی خان پٹھان، جیسے ان کا اپنا کوئی ذاتی نام نہیں، بس ایک ماڈل ہے۔

انگریز کے چلے جانے کے بعد ہماری اسٹیبلشمنٹ نے پٹھان پراجیکٹ کو آگے بڑھاتے ہوئے پختونوں کے علاقے کو این ڈبلیو ایف پی کے بے مقصد سمتوں والے نام سے موسوم کیا۔ جبکہ باقی صوبے بھی تو کسی نہ کسی سمت میں موجود تھے لیکن ان کو قومی ناموں سے پکارا گیا۔ قوم پرست سیاسی جماعت اے این پی نے اس مسئلے کو سمجھا اور اس کے لیے عشروں پر محیط ایک بھرپور مہم چلائی۔ یوں سرکار نے این ڈبلیو ایف پی، خیبر پختونخوا میں تبدیل کیا، لیکن "خیبر پختونخوا" اپنے مشکل، نامانوس تلفظ اور ادائیگی کی بنا پر پراجیکٹ پٹھان والوں نے بڑے غور و فکر کے بعد منتخب کیا تھا۔ اس لیے نام کی تبدیلی کے بعد بھی پراجیکٹ پٹھان، ختم نہیں ہوا تھا۔ اس لئے آج بھی ملک کے کسی بھی اخبار، ٹی وی، ریڈیو، سرکاری تقریب اور تقریر میں پختون کی شناخت مٹانے کی خاطر پختونخوا کا لفظ ادا نہیں کیا جاتا۔ پختون کو سندھی اور بلوچ کے ساتھ لپیٹ کر پٹھان کہا جاتا ہے اور پختونخوا کو کے پی کے۔ جبکہ پختونخوا کے لفظ میں دوسرا کے ہے ہی نہیں۔ چند دنوں پہلے ایک صحافی دوست کو اس کی اخباری رپورٹ میں لفظ کے پی کے، کی طرف اس کی توجہ مبذول کرائی تو اس نے کہا ایسا ہی لکھنے کا حکم ہے۔

بھٹو تو دُور آپ تو نواز شریف بھی نہیں

میں نے انہیں جب بھی دیکھا، جب بھی سنا، سوچا کہ اسے بتا دوں کہ عمران خان صاحب اب آپ کرکٹ ٹیم کے گیارہ کھلاڑیوں کے کپتان نہیں ہیں بلکہ بائیس کروڑ لوگوں اور چھ لاکھ فوج کے ایٹمی ملک کے ذمہ دار وزیر اعظم ہیں۔ پتہ نہیں کیوں انہیں وزیر اعظم بننے کا اعزاز کرکٹ ٹیم کے کپتانی سے کمتر لگتا تھا۔ جبکہ کرکٹ میں بھی ان کی وجہ شہرت مختلف قسم کی سکینڈلز تھے کیونکہ ان کی کارکردگی کبھی بھی مستقل اور لمبے عرصے تک ورلڈ کلاس نہیں رہی۔ انہوں نے 88 ٹیسٹ میچز میں 37.69 کی ایوریج سے 3807 رنز بنائے جبکہ ٹیسٹ باؤلنگ میں 22.81 کی ایوریج سے 8258 رنز دے کر 362 وکٹ لیے۔ جبکہ ون ڈے کیریئر میں کل 175 میچز کھیل کر 33.41 کی ایوریج سے 3709 رنز بنائے اور باؤلنگ میں 26.61 کی ایوریج سے 4844 رنز دے کر 182 وکٹ لیے۔ ان کو یاد ہی نہیں کہ جس ورلڈ کپ کے نشے سے وہ نکل نہیں سکتے، اس ورلڈ کپ میں نہ وہ پاکستان کی طرف سے ٹاپ سکورر تھے اور نہ ٹورنامنٹ کی لیول پر۔ وہ پاکستان کی طرف سے ٹاپ وکٹ ٹیکر باؤلر تھے اور نہ ہی ٹورنامنٹ کی لیول پر۔

ان کی سٹریٹیجی سوشل میڈیا پر شہرت کے بھوکے صارف سے مشابہ تھی جو کسی مشہور شخصیت کے ساتھ تصویر بنا کر اپلوڈ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں فلاں کے ساتھ۔ اس نے بڑی بڑی مشہور ہیروئینوں کے ساتھ سکینڈلز بنا کر خود کو لائم لائٹ میں رکھا۔ نواز

شریف اور ضیاء الحق سے مالی فوائد کے علاوہ ان کے ساتھ خبروں کی زینت بھی بنتے رہیں۔ جمائمہ سے شادی دیسی ذہن کی رومانیت ہے۔ مالکوں کی لڑکی سے شادی دیسی بندے کی زخمی آتما کا سیر اب شدہ خواب ہوتا ہے۔

عمران نے جمائمہ سے شادی کرکے خود کو ان کا خواب بنادیا۔ وہ اتنا چالاک سیاستدان ہے کہ باقی سیاستدانوں سے ووٹر پیسے لیتے ہیں جبکہ عمران خان نے اپنے چاہنے والوں سے چندے بھی لیے اور ووٹ بھی۔ انہوں نے بڑی منصوبہ بندی اور موقع شناسی سے خود کو لارجر دین لائف پروجیکشن دلاکر وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا۔ جبکہ اسی ٹورنامنٹ کا جس کی کہانیاں عمران خان اپنے بچوں سے لے کر ٹرمپ اور پوٹن کو بھی سنا چکا ہے، اس کا لیڈنگ وکٹ ٹیکنگ باؤلر آج بھی ٹی وی پر اشتہارات میں خواتین کو واشنگ پاؤڈر بیچ کر زندگی گزار رہا ہے۔ باقی دس کھلاڑی کس حالت میں ہیں وہ نہ عمران خان جانتا ہے نہ قوم۔

1992 کے ورلڈ کپ کے پہلے میچ میں عمران خان تھا ہی نہیں، دوسرے میچ کو عامر سہیل کی سینچری نے جتوایا، تیسرے میچ میں پاکستان کی پوری ٹیم 74 رنز پر آؤٹ ہوئی تھی جس میں عمران خان پھر موجود نہیں تھا، اگلے میچ میں ساؤتھ افریقہ کے خلاف اس نے صرف دس رنز بنائے تھے جبکہ اس سے اگلے میچ میں انڈیا کے خلاف عمران خان زیرو پر آؤٹ ہوا تھا اور آسٹریلیا کے خلاف کھیلے گئے اگلے میچ میں وہ سات رنز بنا کر آؤٹ ہوا تھا۔ اگلے میچ میں سری لنکا کے خلاف وہ پھر زیرو پر آؤٹ ہوا اور سیمی فائنل جیسے اہم ترین میچ میں نیوزی لینڈ نے پاکستان کو 264 کا ٹارگٹ دیا تو عمران خان نے 93 بالوں پر 44 سکور کرکے رن ریٹ آٹھ پر پہنچایا تھا، اگر انضمام الحق 37 بالوں پر 60 رنز نہ بناتا تو پاکستان وہ میچ عمران خان کے سلو رنز ریٹ کی وجہ سے ہار چکا تھا۔ اسی طرح فائنل میچ میں وسیم اکرم نے مخالف ٹیم کے دو بہترین کھلاڑی یکے بعد دیگرے آؤٹ کیے تو میچ پاکستان کے حق میں ہوا۔ اب اسی ورلڈ کپ میں اسی معمولی کارکردگی کے ساتھ عمران خان ورلڈ کپ کا شہ بالے بنتا ہے جبکہ باقی دس کھلاڑی باراتی نظر آتے ہیں۔

دس دس سال تک مسلسل ورلڈ کپ جیتنے والے تو جہانگیر خان اور جان شیر خان بھی

ہیں۔ وہ نارمل لوگوں جیسے زندگی گزارتے ہیں اور عام لوگوں جیسا رویہ رکھتے ہیں۔ شہر کے غمی شادی میں شرکت کرتے ہیں لیکن کبھی ان کے منہ سے کسی سکواش مقابلے یا ورلڈ کپ کی بات بلا ضرورت نہیں سنی۔ نہ کبھی ان کو چوک یادگار میں کھڑے ہو کر سکواش چیمپئن شپ پر عوام کو تقریر کرتے ہوئے سنا ہے۔ جب تک کہ ان سے خصوصی طور پر پوچھا نہ جائے وہ کھیل پر بات ہی نہیں کرتے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ برٹش سکواش چیمپئن شپ کھیلنے سے پہلے جان شیر خان اور جہانگیر خان کی جوڑی پی ٹی وی پر معین اختر کے پروگرام میں مہمان تھی۔ معین اختر نے اپنے مخصوص انداز میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان سے کہا کہ آپ سکواش کھیلنے نہیں جا رہے ہیں آپ تو جیتنے جا رہے ہیں، اور یہ سچ بھی ہے۔ ایک دفعہ جان شیر خان کہہ رہا تھا کہ مسلسل جیت نے اسے بور کر دیا ہے کیونکہ گیم میں کوئی مقابل ٹکتا ہی نہیں تھا۔

جبکہ دوسری طرف عمران خان خود میدان میں اترتے تو ان کو خود بھی پتہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کھیلنے جا رہے ہیں یا ہارنے، وکٹ لینے جا رہے ہیں یا مسل پل کرنے۔ یہی بات معین اختر نے ایک دن ٹی وی پروگرام میں عمران خان کو چھیڑتے ہوئے کہی تھی کہ باقی کھلاڑی گیند مار کر چڑھاتے ہیں اور آپ پٹھا چڑھاتے ہیں۔ جان شیر خان اور جہانگیر خان اکیلے اپنے زور بازو پر دس دس سال تک دنیا بھر میں منعقدہ سارے کپ جیتتے رہے ہیں، کرکٹ کی طرح گیارہ کھلاڑیوں کی زور پر ایک کپ نہیں جیتا، اس کے باوجود اپنے ساتھی گیارہ کھلاڑیوں کو عمران خان آج تک کوئی کریڈٹ دینے کو تیار ہیں نہ اس دن انہوں نے ان کو کوئی کریڈٹ دی تھی جب وننگ ٹیم کے کپتان کی حیثیت سے گراؤنڈ میں کھڑے ہو کر انہوں نے تقریر کی تھی۔ دیکھنے والوں کو یاد ہو گا عمران خان نے اپنی ٹیم کے کھلاڑیوں کی تعریف یا شکریہ میں ایک لفظ تک ادا نہیں کیا تھا۔

عمران کی طرح یونس خان بھی ایک کرکٹ ورلڈ کپ جیت کر لائے ہیں، جو پاکستانی کرکٹ ٹیم کے سب سے زیادہ کلین اور اصولی کھلاڑی ہیں، وہ بھی مردان شہر میں تعزیتوں اور شادیوں میں شریک ہوتے ہیں۔ جو بات محفل میں ہوتی ہے اس پر بات کرتا ہے، کبھی

کرکٹ کیریئر پر تقریر کرتے ہوئے اور لوگوں کو عقل دیتے ہوئے نہیں دیکھا، جس طرح خان صاحب کرتے ہیں۔ ٹرمپ سے ملاقات ہو یا کسی شہزادے سے، اقوام متحدہ ہو یا قانون ساز اسمبلی، جہاں ان کو موقع ملتا ہے خان صاحب کرکٹ کی کہانی شروع کر دیتے ہیں۔ جبکہ جب وہ کھیلتے تھے، تو ہم دیکھتے تھے۔ جب وہ فارن ٹورز پر جاکر ٹیم ڈسپلن کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی اداکارہ سے ملنے رات کو ہوٹل سے غائب ہو جاتے تھے اور صبح مسل جواب دینے کی وجہ سے بالنگ نہیں کر سکتے تھے، تو ہم اس کی کہانیاں کرکٹ میگزینوں میں پڑھتے تھے۔ لوگ پھر بھی ان کی محبت میں ان کی صحت یابی کے لئے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ وہ کرکٹ کے میدان میں اترتے تو جہانگیت خان اور ضان شیر خان جیسے جیتنے کیلئے نہیں اترتا کیونکہ کپ جیتنے والے دن کی تقریر میں عمران خان نے کہا تھا کہ میرے کرکٹ کیریئر کے اس جھٹ پٹے میں مجھے یقین نہیں آتا کہ میں ورلڈ کپ جیت جاؤں گا جب کہ آج وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انگریز کو مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ میں ان کو شکست دینے کے لئے میدان میں اترتا تھا۔

چلیں مان لیتے ہیں کہ عمران کرکٹ کے عظیم کھلاڑی، بہترین اسٹریٹیجسٹ اور ناقابل شکست کپتان تھے۔ لیکن اس کے احسان میں قوم نے اس کو چندے دے کر ہسپتال بنانے کے قابل بنایا۔ پھر حمید گل اور کمپنی نے اس کو اسٹیبلشمنٹ کے اصطبل میں گروم کرنا کیا جس کی کہانی قوم کے ہمدرد عبدالستار ایدھی نے برملا قوم کو بتادی تھی۔ جس سیاسی جدوجہد کو وہ بائیس سال پر کھینچ کر لے جاتے ہیں وہ دراصل مشرف کے ریفرینڈم سے شروع ہوتی ہے۔ جب اس نے مشرف کی ٹیم میں بھی اسی طرح سیلیکٹ ہونے کی کوشش کی جس طرح کرکٹ ٹیم میں ماجد خان کی سفارش سے سلیکٹ ہوئے تھے۔ مشرف کو اس کی صلاحیت پر یقین نہیں تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ کرکٹ کے تو کپتان تھا لیکن سیاست کے بار ہوا ں کھلاڑی ہے جس کو بینظیر بھٹو اور نواز شریف کے متبادل کے طور پر سائیڈ لائن پر موجود بنچ پر بٹھایا گیا تھا۔ اور وقت نے ثابت بھی یہی کیا کہ عمران نواز شریف کے متبادل کے طور پر ٹیم میں شامل کیا گیا تھا، جو نہی وہ فٹ ہوا عمران کو پھر سائڈ لائن پر بٹھایا گیا۔ عمران خان کو بھٹو بننے کی

کوشش بالکل نہیں کرنی چاہیے کیونکہ بھٹو کی طرح امر ہونے کے لئے دار کی رسی ڈکٹیٹر شپ کے سرد موسم میں مفلر کی طرح گردن کے گرد لپیٹنی پڑتی ہے۔ بھٹو تاریخ میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ وہ عمران کی طرح ”سوشل میڈیا کا دور“ کہہ کر دھمکی دینے کا روادار نہیں تھا۔ عمران خان کے خیال میں عوام کا حافظہ بہت محدود اور شارٹ سرکٹ ہوتا ہے لیکن لگتا ہے وہ خود جلد بھول جاتا ہے، کیونکہ جس سوشل میڈیا کی تڑی وہ آج کل کسی کو دے رہا ہے اسی سوشل میڈیا پر اظہار خیال کے بدلے میں وہ پانچ سال قید اور لاکھوں روپے جرمانے کی پیکا قانون لانا چاہتا تھا۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ اونٹ پہاڑ سے چھوٹا ہوتا ہے۔

معاف کیجئے بھٹو تو کیا آپ تو نواز شریف جتنی جرات بھی نہیں رکھتے۔ کیونکہ خط دکھا کر اس کی متن پر بات تک نہیں کر سکتے جبکہ نواز شریف کو غلام اسحاق نے چلنے نہیں دیا تو ٹی وی پر آکر ببانگ دہل کہا کہ میں ڈکٹیشن نہیں لوں گا اور اس دفعہ نکالے جانے پر دو طاقتور ترین جرنیلوں کو نام سے پکار کر کہا کہ آپ دونوں ذمہ دار ہیں۔ جبکہ آپ اپنی تقریر میں کہتے ہیں کہ حکومت تو کیا میری جان بھی چلی جائے تو میں دے دوں گا لیکن این آر او نہیں دوں گا لیکن تقریر ختم کرتے ہی اپ استعفیٰ دینے یا بغاوت پر اترنے کی بجائے دوبارہ رات گذارنے وزیر اعظم ہاؤس چلے جاتے تھے۔

ریاست مدینہ کا دعویٰ کرتے ہیں، بلا سیاق و سباق کے بغیر قرآنی آیات کا ذاتی مفاد کیلئے استعمال کرتے ہیں، قوم کا باپ بن کر اس کی تربیت کا دعویٰ کرتے ہیں پھر لعان اور طعان بن کر دوسروں پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔ جبکہ آپ خود اپنے بچوں کے لئے پورے پاکستان میں کوئی مناسب سکول یا تربیت کا اہتمام نہیں کر سکتے۔ آپ کئی بار مدینہ منورہ چلے گئے، ہما شما بھی جہازوں میں بھر کر لے گئے، لیکن کبھی سلیمان اور قاسم کو مدینہ کی گلیاں نہ دکھا سکیں۔ نہ ان کو خانہ کعبہ کے طواف اور مسجد نبوی کی شب باشی اور درود و سلام کے مسحور کن محفل میں بٹھا سکیں۔ جبکہ کرسمس اور ہانوکا مناتے ہوئے ان کی تصاویر سوشل میڈیا پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ کیا وہ کرسمس اور ہانوکا کی طرح عیدین اور عید میلاد النبی بھی مناتے ہیں؟ کیونکہ نہ آپ کو عوام کے ساتھ مسجد میں عید کی نماز پڑھتے اور عید مناتے دیکھا گیا نہ ایسا کرتے ہوئے ان

کی کوئی تصویر نظر ائی۔

وقار کے ساتھ حکومت نہ کرسکے صرف لفاظی اور پروپیگنڈا کے زور پر وقت گذارہ تو جاتے جاتے باوقار رویہ اختیار کرتے۔ قوم پونے چار سال آٹا گھی تیل دوائیاں چینی بیروزگاری اور مہنگائی روتی رہی اور آپ معیشت گورننس سیاست سفارت پر بات کرنے کی بجائے چھکے چوکے اور باؤنسر کی پکی راگ الاپتے رہے ہیں۔ آپ کو اتنا لاڈ ملا کہ آپ کی خاطر میڈیا مخالف سیاستدانوں رپورٹروں یوٹیوبروں اور تجزیہ نگاروں کو مثبت رپورٹنگ نہ کرنے کی پاداش میں جان کے لالے پڑے۔

آپ کی حکومت کا مقصد عوام کے لئے آسائشیں اور اور آسانیاں نہیں تھا، آپ نے صرف مخالفین کی پگڑیاں اچھالنی تھیں پاکستان کی سیاست بہت بری سہی لیکن اس میں مخالف کی بہو بیٹیوں کا تقدس برقرار رہا ہے آپ نے اس کا بھی لحاظ نہیں کیا، تبھی تو کل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے زرداری جیسے دھیمے سیاستدان کو کہنا پڑا کہ ایک شخص کے علاوہ میں ہر مخالف سے گلے ملنے کو تیار ہوں۔

بائیس سال کی گرومنگ، سٹیٹ مشینری کے بے دریغ پش پناہی، سینکڑوں گھنٹے کی بلا تعطل میڈیا کوریج، اعلیٰ لیول کی عدالتی بے ایمانیوں، ہزاروں سرکاری سائبر سپورٹروں، دائیں بائیں موجود ہمہ وقت اے ٹی ایم مشینوں اور ان کے جہازوں، صابر شاکروں حسن نثاروں اور ارشاد بھٹیوں کی دن رات ایمان افروز کوششوں کے باوجود، آپ سمپل میجارٹی پر مبنی ایک حکومت نہیں بنا سکے، اور اب جب زمین جلنے لگی ہے تو آپ بھی علی محمد خان کی طرح سمجھتے ہیں کہ آپ پھر آ جائیں گے اور وہ بھی ٹو تھرڈ میجارٹی سمیت۔ خیال رکھیں آپ بھٹو نہیں ہے اور بھٹو بننے کی کوشش بھی نہ کریں کیونکہ اس کی واپسی کی ڈر سے انہیں راولپنڈی سے رات کے اندھیرے میں گڑھی خدابخش کے آخری سفر پر روانہ کیا گیا تھا۔ آپ کے لئے بہترین مثال نواز شریف ہیں، آپ ان کا راستہ اپنائیں لیکن وہ بھی کافی کٹھن ہے، آپ سے نہیں ہوسکے گا۔

گلے میں جو سر لٹکانے کی خواہش

جس طرح ہر سپاہی کی خواہش ہوتی ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد گاؤں میں اسے صوبیدار صاحب بلایا جائے اسی طرح ہر ہومیو پیتھک معالج کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے ڈاکٹر پکارا جائے، تب ہر ہومیو کلینک پر معالج کے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھا ہوا ہوتا ہے، بلکہ میڈیکل ڈاکٹروں کی ہومیو معالجین کے ساتھ سب سے بڑی لڑائی یہی ہے کہ ہومیو معالج ڈاکٹر نہیں ہوتے، پھر ساتھ ڈاکٹر کیوں لکھتے ہیں۔

پچھلی رات کو سلیم صافی کے ٹی وی شو 'جرگہ' میں ایک ہومیو معالج کے گلے میں سٹیتھیسکوپ دیکھ کر یہی احساس ہوا۔ اگرچہ وہ حضرت حقیقی ہومیو معالج تھے، اور شاید اٹلی سے آن ائر تھے، مگر میں نے تو ایسے حقیقی ڈاکٹر بھی دیکھے ہیں، جن کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ ان کو ڈاکٹر سمجھیں۔ جس کی خاطر وہ نماز پڑھنے کے لیے مسجد جاتے ہوئے بھی، سٹیتھیسکوپ گلے میں لٹکا کر جاتے ہیں۔ ایسا کرنا ایک بالکل فطری انسانی کمزوری ہے، ایسا انسان کسی نہ کسی وجہ سے خود کو دوسروں سے برتر سمجھتا ہے اور اسی برتری کے اظہار کے احساس کمتری میں مبتلا ہوتا ہے۔

یہ بالکل ایسا ہے جیسے آرمی سے ریٹائر کردہ کیپٹن اور میجر، اپنے ناموں کے ساتھ عمر بھر کیپٹن اور میجر (ریٹائرڈ) لکھتے رہتے ہیں۔ اگرچہ آرمی سے ریٹائرڈ کردہ کیپٹن اور میجر، بشرطیکہ ڈسپلنری مسائل کی وجہ سے نہ نکالے گئے ہوں، اپنے پیشے کے نالائق ترین لوگ

ہوتے ہیں، جو کسی نہ کسی طریقے سے آرمی افسر تو بن جاتے ہیں لیکن آگے دو قدم چلنے کے قابل نہیں ہوتے۔ آرمی کے اندر یہ لوگ ایسے ہوتے ہیں جس طرح پرائمری سکول کا نالائق ترین سفارشی استاد ہوتا ہے۔ پاکستان ویسے تو بنجر ہے لیکن ریٹائرڈ آرمی افسران کے سلسلے میں کسی نخلستان سے کم نہیں۔ لوگ بھلے ان کو پاکستان کی بدقسمتی سمجھے یہ خود کو اس ملک پر احسان سمجھتے ہیں۔ تبھی تو ریٹائرڈ کیپٹن اور میجر دفاعی ماہرین کی شکل میں بعض نیوز چینلز پر ماہرانہ رائے تک دیتے ہوئے دیکھے جاسکتے ہیں۔

خود نمائی پر مبنی یہ احساس کمتری صرف شخصیات تک محدود نہیں، بعض پورے خاندان اس امتیازانہ بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اچھا خاصہ چاچا، بھتیجے بھتیجیوں کے لیے انجینئرنگ کرنے کے بعد انجنیئر صاحب ایس ڈی او صاحب اور ایکسین صاحب بن جاتا ہے ورنہ ناراض ہوتا ہے۔ دور رہائش پذیر بھانجے بھانجیاں مہمان بننے سے پہلے نئے عہدے اور خطاب کی مناسبت سے باقاعدہ ماں سے تازہ ترین بریفنگ لیتی ہیں۔ اگرچہ ڈاکٹر انجینئر کے مقابلے میں معاشرے میں آسانی سے اپنی پہچان پیدا کرلیتا ہے۔

بات شروع ہوئی تھی سٹیتھیسکوپ والے ہومیو معالج سے اور پہنچی ریٹائرڈ میجر صاحب اور وہاں سے ایکسین چاچا تک۔ ممکن ہے ریٹائرڈ کیپٹن اور میجر صاحب، آرمی سے ہماری محبت کا غلط فائدہ اٹھا رہا ہو، یا شاید ہمیں ڈرانے کے لئے وہ ایسا لکھتا ہو کیونکہ میجر جو ہوئے۔ یا شاید اس کی ٹوپی میں بس یہی ایک نمایاں پر ہوتا ہے۔

پختونخوا کے دوسرے بڑے شہر مردان میں، کبھی ایک مشہور ڈاکٹر ہوا کرتے تھے، نام میں کیا رکھا ہے۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے نے ان کی گدی اور مریض دونوں سنبھال لیے۔ ممکن ہے ابھی بھی وہ اپنے باپ کے نام والے بورڈ کے نیچے اپنی پریکٹس کرتا ہو۔ ڈاکٹر کا بیٹا خود بھی ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھا۔ اس ڈاکٹر کے ڈاکٹر بیٹے کی دو خواہشات بڑی نمایاں تھیں، مقامی روایتی معاشرے میں آج سے کوئی دس پندرہ سال پہلے، پینٹ پہننا اور سٹیتھیسکوپ گلے میں لٹکا کر بازار میں پھرتے رہنا۔

شاید اسے بھی خود کو ڈاکٹر منوانے کی شدید خواہش تھی۔ ڈاکٹر کی کلینک کے سامنے

جوس اور ملک شیک کی دکانیں تھیں۔ ایک دن اسی مرحوم ڈاکٹر کا ڈاکٹر بیٹا سٹیتھیسکوپ گلے میں لٹکائے ملک شیک والی دکان پر آیا، ملک شیک کی دکان کا مالک، ڈاکٹر کا کلاس فیلو تھا، ڈاکٹر نے ملک شیک مانگی تو دکاندار نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ ڈاکٹر ہیں اور میں ملک شیک بیچنے والا، اگر میں آپ کی طرح اپنا جوسر گلے میں لٹکا کر بازار میں پھروں گا تو لوگ مجھے پاگل کہیں گے، لیکن آپ بازار میں سٹیتھیسکوپ پہن کر سمجھتے ہیں کہ لوگ آپ کو ڈاکٹر کہیں گے۔ وہ ڈاکٹر دکاندار پر غصہ کرتے ہوئے، ملک شیک پیئے بغیر کلینک واپس چلا گیا۔

نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم احتجاجی سیاست اور اتحادی احتجاجوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ وہ روایت پسند شخصیت اور مرنجان مرنج سیاستدان تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ اگر کبھی خود بھی صدر یا وزیراعظم بن گئے تو مختلف سیاست دانوں کی اتحاد بنا کر اپنی حکومت کے خلاف احتجاج کریں گے۔ جس طرح اچھا باؤلر ضروری نہیں کہ اچھا بیٹسمین بھی ہو اسی طرح بعض سیاست دان صرف احتجاجی سیاست ہی کر سکتے ہیں۔ وہ جو تقریریں مطالبے اور وعدے حکومت ملنے سے پہلے کرتے ہیں حکومت ملنے کے بعد بھی وہی کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی اپنی اس 'خوبی' کا اقرار خود بھی کر لیتے ہیں کہ حکومت کرنا بڑا مشکل ہے بندہ کس کس کی سنے کس کس کو راضی کرے؟ جس کا آسان الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ مخالفت کرنا آسان ہے حکومت کرنا مشکل، بالفاظ دیگر میں حکومت مخالف ہوتا تو اچھا تھا۔

انڈہ دینا مشکل ترین کام ہے ناشتہ کرتے ہوئے انڈے کو اچھا یا برا کہنا آسان کام ہے۔ سینیٹ کے انتخابات جیتنے ہوں یا چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین کے، ثابت ہوا آپ کو اس میں کمال حاصل ہے۔ آپ سیاست کے سارے گر سیکھ چکے ہیں وہ بھی جس کو دوسرے بروئے کار لے آئیں تو بقول آپ کے کرپشن ہے۔ سیاست کے سارے گرو خاک چاٹتے رہیں، ساری طاقتیں آپ کے کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑی ہوں، کوئی مخالف نہ ہو، سارے اخبارات اور ٹی وی چینلز آپ کے حق میں رطب اللسان ہوں، سارے صابر شاکر، حسن نثار، سمیع ابراہیم، اسد کھرل، ارشاد بھٹی، ہارون الرشید اپکو ڈیگال ثابت کرنے میں جتے ہوں،

بھاری بھر کم اشرفی یا لاکھوں فالورز کا سیلیبریٹی طارق جمیل آپ کو خلیفہ عصر کہدے، شہباز گل، فردوس عاشق اعوان، فیاض الحسن چوہان یا علی محمد خان کی تقاریر سن کر آپ خود بھی خود کو وہی سمجھنے لگیں جو وہ آپ کو باور کراتے ہیں۔ جب تک کہ آپ کو حکومت کرنی نہیں آئے گی، جب تک کہ خلق خدا آپ کو اپنی دعاؤں میں شامل کرنا شروع نہ کر دے یہ سب محض سامریت ہے جو اپنی تمامتر طلسماتی جولانیوں کے باوجود محض واہمہ ثابت ہو گی۔

مان لیں آپ حقیقی وزیرا عظم ہیں، مان لیں لوگ کسی چوہان گل یا عاشق اعوان کی درفنطنی سے متاثر نہیں ہوتے، وہ اپنے بجھتے ہوئے چولھوں اور کم ہوتی ہوئی قوت خرید سے متاثر ہو رہے ہیں۔ آپ کو سیاست دان سمجھ کر ووٹ دیے گئے تھے کوئی منتقم مزاج جلاد سمجھ کر نہیں۔ بدعنوانی کے خختم کرنے کی مشن میں آپ ناکام ہیں بلکہ خود انتخابات کے دوران وہی کچھ کرتے رہیں جس کے خلاف آپ نے لڑنے کا عزم کیا تھا، حکومت چلانے میں بھی آپ خود کو ناکام ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یقین کر لیں، آپ ہی وزیرا عظم ہیں آپ ہی ان سب چیزوں کے ذمہ دار ہیں، آپ کو کیوں بشری بیگم کی یاد دہانی کی ضرورت پڑتی ہے؟

عمران خان
وزیر اعظم ہاؤس سے ایک ڈائری کیوں لے گئے ؟

سیکورٹی تین قسم کی ہوتی ہے، بلڈنگ کی، شخصیت کی اور دستاویز کی۔ پھر سیکیورٹی کے اپنے اپنے مدارج ہوتے ہیں جو وقت کے ساتھ گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ علی محمد خان نے اپنی ٹویٹ میں بتایا کہ بنی گالا جاتے ہوئے لگا کہ عمران کی سیکورٹی کم کر دی گئی ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ عمران خان اب سابقہ وزیر اعظم ہے۔ اسے سٹیٹ لیول یا زی سیکورٹی نہیں دی جاسکتی۔

اقسام اور مدارج کی طرح سیکورٹی کلیئرنس بھی ایک اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ جو عہدیدار جتنے حساس فرائض انجام دیتا ہے اس کی سیکورٹی کلیئرنس اتنی اعلیٰ درجے کی اور کم عرصہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ کم عرصہ سیکورٹی کی وجہ سے اسے بار بار سیکورٹی کلیئرنس سے گزارہ جاتا ہے۔ امریکہ میں کوئی ذاتی یا سرکاری حیثیت میں صدر سے ملنے آرہا ہو تو جب تک سیکرٹ سروس اسے اوکے نہ کردے اسے کسی نہ کسی بہانے ٹالا جاتا ہے۔ یہی سیکورٹی کلیئرنس کا عمومی پروسیجر ہے۔

عمران خان کو جب سیاست کا بارہواں کھلاڑی چنا گیا کیونکہ اس نے نواز شریف اور زرداری کے متبادل کے طور پر کام کرنا تھا، تو سلیکشن کمیٹی کو ایک مسئلہ عمران خان کی سیکورٹی کلیئرنس کا بھی درپیش تھا۔ عمران خان کا رنگین ماضی سٹیٹ لیول کے عہدہ دار بنانے میں اس

کے مزاحم تھا۔ دوسرا بیرون ملک مقیم اس کے طاقتور رشتہ دار اس کے سیاسی راستے کی دیوار ثابت ہو رہے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ اس نے اپنی سیکورٹی مدارج کو بہتر بنانے کی خاطر اپنے خاندان والوں سے علیحدگی اختیار کی ہو۔ پھر اس کے بچے جو بلا روک ٹوک اس کی سٹڈی، میٹنگ روم اور دوسرے سرکاری فرائض کے درمیان اس کے پاس آ جاسکتے تھے وہ ایک اور بڑا گمبھیر مسئلہ تھا۔

سینکڑوں دنوں پر محیط اور لاحاصل دھرنے نے عمران خان کو مایوس کیا تھا یا شاید اسے ایک خاتون کی خاتون اول کے طور پر ضرورت تھی اس لیے اس نے ریحام خان کے ساتھ اپنا تعلق بڑھایا، جو بعد میں مختصر شادی پر منتج ہوا۔ ریحام خان کے ساتھ شادی نے عمران خان کو ایک آئیڈیل سیاسی اور سماجی جیون ساتھی مہیا کیا تھا، جو میڈیا میں جتنا عمران خان کا امیج بلند کرتا رہا اتنا اس کی سیاسی اور فلاحی کاموں میں مددگار بھی ثابت ہوتا رہا۔ لیکن یہ خانگی مداخلت اس کے سیاسی گوروں یعنی حمید گل اور کمپنی کو ایک آنکھ نہیں بھائی۔ سہولت کاروں کے علاوہ سرمایہ لگانے والوں کو بھی ریحام خان سے شدید خطرات لاحق تھے۔ کیونکہ ریحام سے عمران خان صاحب کو ڈو اینڈ ڈونٹ کے مشورے ملنے شروع ہو گئے تھے۔ پہلے مردانہ محفلوں میں ترنگ میں آ کر وہ فائنانسرز کو کوئی بھی فیور دے سکتے تھے لیکن اب فیصلے کل پر ٹالے جانے لگے۔ اس لئے ریحام خان کے خلاف کرپشن اور ایم آئی سکس کی ایجنٹ کے الزامات پھیلائے گئے۔ جبکہ عمران خان کو ایم آئی سکس کے ساتھ ملوث کرنے یا بچانے کے لئے گولڈ سمتھ فیملی کافی تھی ریحام خان کی ان کے سامنے کیا حیثیت تھی؟ یا ایم آئی سکس اتنی باؤلی ہے کہ اتنے طاقتور اتحادیوں کی موجودگی میں وہ ایک ویدر گرل کو اپنا اثاثہ بنا کر عمران خان کی زندگی میں داخل کرتی۔ پاکستان کوئی نارتھ کوریا جیسا بند ملک ہے اور نہ عمران خان کم جانگ اون، کہ جہاں تک ایم آئی سکس کی پہنچ نہیں تھی۔ پاکستانی ایجنسیوں سے پہلے شاید ایم آئی سکس نے عمران خان کا پروفائل بنایا ہو، بہر حال وہ ایک مشہور پاکستانی کرکٹر تھا جس کا زیادہ تر وقت برطانیہ میں گزر رہا تھا۔

آج عمران خان جس قسم کے مسائل سے دوچار ہے، فائنانسرز اور سہولت کاروں

نے انہیں مد نظر رکھ کر ریحام خان کا کانٹا نکالنا ضروری سمجھا ہو گا۔ کل عمران خان کو کسی بھی کیس میں نااہلی یا جیل کی سزا ہو جائے تو ہر کوئی جانتا ہے کہ عمران خان سیاسی طور پر لاوارث ہے۔ پارٹی شاہ محمود قریشی اسد عمر یا پرویز خٹک کے پاس چلی جائے تو عمران خان کے پاس واپسی ناممکن ہو جائے گی۔ سلمان اور قاسم کی زندگی رجحانات تعلقات اور پوشیدہ گوشوں کے بارے میں ہماری ایجنسیاں ہم سب سے زیادہ جانتی ہوں گی اس لیے ان کا پاکستان آکر پارٹی سنبھالنا یا والد کے لئے تحریک چلانا ناممکن ہے۔

عمران خان جب مجموعی استعفوں کا کہہ کر کوئی فیصلہ کن اقدام نہیں کر سکتا تو اس کے پیچھے بھی اس کا یہی خوف ہے، کہ اگر وہ جیل چلا گیا اور پارٹی اسمبلی میں رہی تو اس کی غیر موجودگی میں اسے کوئی طالع آزما ہائی جیک کر دے گا۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ زیادہ تر ممبران اسمبلی خواہ وہ قومی ہوں یا صوبائی اسمبلیوں کے استعفیٰ دینا نہیں چاہتے، جس کا بہترین مثال خیبر پختونخوا اسمبلی ہے۔ جہاں حزب اختلاف نے پہلے وزیر اعلیٰ کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کی اور بعد میں واپس لے لی۔ راقم نے عدم اعتماد پیش کرنے والے ایک ممبر پارلیمنٹ سے تحریک واپس لینے کے بارے میں پوچھا تو جواب ملا کہ وزیر اعلیٰ کو عمران خان کی طرف سے اسمبلی تحلیل کرنے کا ڈر تھا جس کی وجہ سے اس نے خود حزب اختلاف کو تحریک عدم اعتماد لانے کا مشورہ دیا تھا اب مرکز میں حکومت ختم ہونے کے بعد وہ ڈر ختم ہو گیا اس لئے عدم اعتماد کی تحریک واپس لے لی گئی۔

ایک طرف عمران خان زیادہ سے زیادہ جلسے کر کے اور زیادہ سے زیادہ لوگ سڑکوں پر نکال کر دو قسم کے مفاد حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ عوامی طاقت کے ذریعے ایک طرف حکومت کو دباؤ میں لا کر جلد انتخابات کا راستہ نکال رہا ہے تاکہ وہ جیل جانے سے بچ جائے اور ممکن ہو تو دوبارہ اچھی اکثریت کے ساتھ حکومت میں واپسی کر لے اور دوسری طرف وہ اپنے ان ممبران اسمبلی پر پریشر بڑھانا چاہتا ہے جو اسمبلیوں سے استعفیٰ دینے کے حق میں نہیں ہیں تاکہ ان کو قائل کر سکے کہ عوام اب بھی عمران خان کے ساتھ ہیں تبھی تو وہ کہتا رہتا ہے کہ اس دفعہ پارٹی ٹکٹ وہ اپنی مرضی کے امیدواروں کو دے گا اور ساتھ

قانون اور آئین کی دھجیاں بکھیرنے والے قاسم سوری کو جلسوں میں ہیرو بنا کر پیش کرتا ہے تاکہ باقی ممبران کو اس جیسا رویہ اختیار کرنے کی ترغیب ملے۔

اگرچہ اسمبلی سے استعفیٰ دے کر عمران خان اپنی رہی سہی قانونی ڈھال اور مراعات سے بھی ہاتھ دھولے گا لیکن اسے پتہ ہے کہ یہ اس کا آخری جوا ہے جو اگر وہ جیت نہیں سکا، تو پھر اس کی بڑھتی ہوئی عمر اور طویل پاکستانی عدالتی پراسس اسے دوبارہ راج سنگھاسن پر بٹھانے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔

سیاسی طور پر لاوارث عمران خان کو اس وقت ریحام خان کی افادیت کا اندازہ ہو جاتا، جو پارٹی معاملات مقدمات اور پارلیمنٹ کے اندر اس کا بے بدل اثاثہ ہوتی، جبکہ عمران خان کو اپنا آخری جوا کھیلنے کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ عمران خان نے گزشتہ سال کئی بار کسی نامعلوم ذریعے کو اپنی تقاریر میں اپنی لاچارگی کا اظہار کرتے ہوئے بتانے کی کوشش کی کہ 'آئی ایس آئی میرے فون سنتی ہے' اسے پتہ ہے کہ میں کرپٹ نہیں ہوں۔ اس بیان میں اہم حصہ کاماز کے درمیانی حصہ ہے اس پیغام کی شدت کو کم کرنے کے لئے اپنی ایمانداری کا ٹکڑا لگانا اس کی مجبوری لگتی ہے۔

عمران خان کے قریبی رشتہ داروں کی لو لیول سیکورٹی کلیئرنس کی وجہ سے اسے وزیراعظم ہاؤس منتقل نہیں ہونے دیا گیا تھا۔ کیونکہ وہاں پر صرف وزیراعظم کا گھر نہیں پورا سیکرٹریٹ موجود ہے۔ اس لیے وزیراعظم ہاؤس کو یونیورسٹی بنانے کا شوشہ چھوڑا گیا تاکہ اصل مسئلہ عوام سے سامنے چھپا رہے۔ یوں خان صاحب کو ایک کتے سمیت ہیلی کاپٹر کے ذریعے آمدورفت کی سہولت دی گئی تاکہ ان کے رابطے کم سے کم ہو جائیں اور وہ کتا بھی سرکاری ہے، بعد میں کابینہ میں آدھے درجن سے زیادہ غیر ملکیوں کی موجودگی نے سیکورٹی ایجنسیوں کے حفظ ماتقدم پر مبنی خدشات کو بالکل سچ بھی ثابت کر دیا۔

اس لیے جب خان صاحب اقتدار کی آخری رات وزیراعظم ہاؤس سے بنی گالا کے لئے نکلا جس کا اس کے چاہنے والے بڑے فخر سے سوشل میڈیا پر ذکر کرتے ہیں کہ اس نے وہاں سے فقط ایک ڈائری لی اور بنی گالا کے لئے روانہ ہوا تو وہ جانتے نہیں کہ خان صاحب

وزیر اعظم ہاؤس میں نہیں بنی گالا میں رہتے تھے، جہاں پر سرکاری کام کرنے کے بعد وہ اپنے ساتھ کسی فائل کی بجائے صرف اپنی ذاتی ڈائری لے جاسکتے تھے۔

لاہور کے طالبان اور مزار شریف کا تا قیامت زندہ کافر

پاکستان کے دوسرے علاقوں کے بارے میں میں یقین سے نہیں جانتا، لیکن پختونخوا کے کھاتے پیتے خاندانوں کے نوجوان، ایک وقت تھا، سیر کرنے اور انڈین فلمیں دیکھنے کے لئے کابل جایا کرتے تھے۔ جو واپس آ کر دوستوں کے محافل میں مدتوں کابل کی آسودگی، خوبصورتی، ترقی، پھلوں، ارزانی اور مہمان نوازی کی کہانیاں سناتے رہتے۔ بچپن میں کابل میرے ذہن میں 'چین ماچین' اور کوہ قاف جیسی ایک طلسماتی سرزمین تھی۔ جہاں پریاں بستی تھیں، پھول، پھل، خوشبوئیں اور آزادیاں گلے مل کر گاتی تھیں۔ بچپن میں میری شدید خواہش تھی کہ بڑا ہو کر بہت سارے اور کاموں کے علاوہ کابل کی خوبصورتی دیکھنے ضرور جاؤں گا۔ کابل کے علاوہ مزار شریف جانا بھی میری ایک خواہش تھی، جہاں لیجنڈری تلوار باز اور میرے بچپن کی کہانیوں کا ہیرو یعنی 'دوست د خدائی' (نبی اسلام ﷺ) کے کزن، داماد اور دوست دفن ہیں۔ جنہوں نے ایک کافر کو کسی جنگ میں ایسی تلوار ماری تھی کہ آج تک اس کا زخم ٹھیک نہیں ہوتا اور جو تا قیامت مزار شریف کے ایک قید خانے میں زندہ ہے۔ ہمارے بزرگ کہانی یوں بتاتے رہتے تھے، کہ جب بھی وہ دن آتے ہیں جب اسے تلوار ماری گئی تھی تو وہ رات کو خواب میں ہڑبڑا کر چیخ اٹھتا ہے کہ تم نے مار دیا علی! تم نے مار دیا مجھے۔ یہی کفریہ کلمات سن کر علی رضی اللہ تعالیٰ نے جواب میں اسے کہا تھا کہ مارنے والا اللہ ہے اور یہ سمجھنے کے لئے تم قیامت تک زندہ رہو گے۔

وہ ساٹھ گز لمبا کافر تب سے زنجیروں میں جکڑا ہوا اس تہہ خانے میں قید ہے۔ اس کے زخم میں ایک من روئی بھری جاتی ہے۔ بڑھاپے کی وجہ سے اس کے پپوٹے اتنے نیچے لٹکے ہوئے ہیں کہ وہ اس کی وجہ سے آنکھیں نہیں کھول سکتا۔ کنڈے لگا کر ان کو اوپر کھینچا جاتا ہے تب کہیں جا کر وہ آنکھیں کھول لیتا ہے اور ملاقاتی کو دیکھ لیتا ہے۔ اس کی آنکھیں دیکھ لینے میں ثواب ہے، کیونکہ اس نے 'دوست دخدائی' (پیغمبر اسلام ﷺ) کو ان آنکھوں سے دیکھا تھا۔ میں ان بزرگوں کو حیرت اور حسرت سے دیکھتا جو مزار شریف کی زیارت کرنے کے علاوہ اس کافر سے بھی مل کر آئے ہوتے جس کو دیکھنے میں ثواب تھا۔

پھر کالج کے دور کو پہنچتے پہنچتے معلوم ہوا کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ یہ باغوں، نہروں، کرکٹ کے میدانوں، تعلیمی اداروں، مزاروں، میلوں، عرسوں، فلمی سٹوڈیوز، اداکاروں اور اداکاراؤں، فیشن اور اخبارات و رسائل کا شہر ہے۔ یہاں مینار پاکستان ہے جو ایک ارادے کی سنگ میل اور شاہی قلعہ ہے جو ایک عہد کی یادگار ہے۔ یہاں ایک بازار ہے جہاں کے باسی رات بھر جاگتے ہیں جہاں تان پورے، طبلے، ستار، وینا، گھونگرو، ہارمونیم اور ڈھولکی کے تال میل کے ساتھ میر و غالب ذوق و فیض کی کلام سے ناآسودہ روحیں آسودگی، زخمی دل مرہم اور باذوق تماشبین اپنی ذوق کی تسکین پاتے ہیں۔ جہاں کھانے پکانا فن اور کھانا کھانا زندگی سمجھی جاتی ہے۔ جہاں ہر سارے اسلامی اور جہادی پارٹیوں کے دفاتر کے علاوہ رنگ رنگ کے خطیب اور اسلامی سکالرز ہیں، جو اس شہر کو رتی بھر تبدیل نہیں کر سکے۔

کابل اور مزار شریف جانے کی ہماری عمر ہوئی تو وہ دونوں بارود خانہ بنے ہوئے تھے۔ وہاں سے سردہ اور اناروں کے ساتھ ساتھ اب پشاور، بم اور گرینیڈ بھی آتے تھے۔ کیونکہ پہلے اللہ کا دین پھیلانے اور ہمیں مسلمان بنانے کے لئے وہاں سے غزنوی، غوری اور ابدالی ہمارے ہاں آتے تھے، لیکن پھر اس نیکی کا دگنا بدلہ چکانے کی خاطر، جب ہمارے ہاں حق اور حقانی پیدا ہوئے، تو ہم خود غوری غزنوی اور ابدالی بن کر اللہ کا دین پھیلانے اور افغانوں کو مذید مسلمان بنانے کی خاطر افغانستان جانے لگے۔

جس افغانستان میں پہلے صرف ایک افسانوی کافر موجود تھا، جس کے زخم میں ایک وقت میں ایک من روئی کام آتی تھی، اور جو قیامت کا منتظر تھا تا کہ وہ مر سکے، وہ افغانستان راتوں رات سب کا سب کافر بنا اور اس کی قیامت چالیس سال ہوئے ختم ہی نہیں ہوتی، جس کے زخم میں ساری دنیا کی روئی اور روئی کے بنے لحافیں بھر دی جائیں تو پھر بھی وہ خون آلود رہتا ہے، مندمل ہوتا ہے نہ بھرتا ہے، جو ممکن ہے خود بھی اپنے زخم کے علاج کے لئے کسی قیامت کا منتظر ہے۔ پہلے افغانستان میں صرف ایک مشہور شہید تھا، جن کے مزار کی وجہ سے وہاں کا پورا شہر مزار شریف کہلاتا تھا، لیکن اب مذہب کی افراط کی وجہ سے پورا افغانستان ایک بڑا 'مزار شریف' بنا ہوا ہے۔

افغانی شہادت کے شوق میں شاید جانتے ہی نہیں ورنہ وہ میرے نزدیک سارے کے سارے جنتی ہیں کیونکہ یہاں اور وہاں کے ہر قبرستان میں ہر گھر کے پانچ پانچ دس دس شہید دفن ہو چکے ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ ایک شہید دسیوں پسماندگان کو فری میں جنت لے جا سکتا ہے، لیکن یہ احمق اب بھی جنت جانے کے چکر میں لڑ لڑ کر اپنی زندگیوں کو جہنم بنا رہے ہیں۔ اگر افغان چاہے تو پوری دنیا کے سارے مسلمانوں کو اپنے کوٹے میں فری میں جنت لے جا سکتے ہیں، اور ہم پاکستانیوں کا تو ان پر خصوصی حق ہے کیونکہ جدید جنت کی مارکیٹنگ اور تعارف ہم نے شروع کرائی تھی، پھر پہلے ان کے غوری غزنوی ابدالی ہماری مرضی کے بغیر ہمیں مسلمان بنانے آتے تھے اور اب ہم ان کی مرضی پوچھے بغیر چالیس سال ہوئے ان کو مسلمان بنانے میں دانے درمے سخنے جان کھپا رہے ہیں۔ لیکن ایک بات ہے اگر وہ ہمیں جنت ساتھ لے گئے تو یہ باہمی جہاد وہاں بھی شروع ہو جائے گا اور وہ ختم ہی نہیں ہو گا کیونکہ قیامت تو گزر چکی ہو گی۔

اللہ کے نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو، لیکن ملا عمر کی قیادت میں افغانستان میں 'دین پھیلانے' کے لئے جو طالبان اور استادان گئے تھے وہ سیاست کو جانتے تھے نہ اقتصاد کو، جغرافیہ سے باخبر تھے نہ تاریخ سے، سفارت کی نزاکتوں سے سروکار تھا نہ بین الاقوامی اصولوں کو درخور اعتنا سمجھتے تھے، جوتے تو وہ پہنتے نہیں تھے اس لئے جوتے کی

نوک پر رکھنے کی بجائے وہ انسانی حقوق کو بندوق کی نال پر رکھتے تھے، کمپیوٹر سکرین ٹی وی سمجھ کر توڑے تو فٹ بال کھیلنے والے مہمان کھلاڑیوں کو اس جرم میں گنجا کیا کہ نیکر پہن کر کھیل رہے تھے۔

تعلقات، دل، شہر، سکول، مزار اور یہاں تک کہ اس بدھا کو بھی سلامت نہیں چھوڑا جس کو 'بت شکن' غزنوی نے بھی معاف رکھا تھا۔ اگر وہ تاریخ کے بارے میں جانتے تو اپنے ہاں بنے مہمان، ایمن الظواہری سے پوچھ سکتے تھے کہ قاہرہ میں سب سے بڑے چوک کا نام رعمسیس کیوں ہے؟ اور مصر فرعونوں کی کمائی (سیاحت سے) کھانے کو کیوں جائز سمجھتا ہے؟ لیکن وہ نہیں جانتے کہ فرعون دریا برد ہو کر نابود ہو چکا ہے لیکن سامری آج بھی زندہ ہے، وہ کسی کہانی میں نہیں مرتا ایک دربار میں شکست کھا کر غائب ہو جاتا ہے تو دوسرے دربار میں نیا سوانگ رچا کر واپس آ جاتا ہے۔

کابل جلال آباد اور مزار شریف کی گلیوں میں عورتوں، چیک پوسٹوں پر ان سے الگ فیشن کے افغانوں، محلے میں ان سے مختلف مذہبی عقیدے رکھنے والی اقلیتوں پر تشدد کرنے والے طالبان، سامری کہتا ہے، بدل گئے ہیں۔ کیونکہ یہ طالبان کہتے ہیں کہ عورتیں دفاتر سکولوں اور ہسپتالوں میں کام کر سکتی ہیں اقلیتوں کی تقریبات میں جانا اور منانا بالکل جائز ہے، داڑھی رکھنا مرد کا ذاتی فیصلہ ہے۔ جبکہ ان کے پہلے دور مہں وہ پٹرول پمپ سے گاڑی میں تیل ڈلواتے وقت ٹنکی میں نوزل داخل کرتے تو اس پر کپڑا ڈالتے تاکہ ٹنکی میں نوزل داخل کرنے سے گندا کوئی خیال نہ آ جائے، کیونکہ گاڑی میں بیٹھی باپردہ عورتیں بھی یہ بے شرمی دیکھ سکتی تھیں، لیکن اب کہتے ہیں، عورتیں برقع نہ پہنے بس اسلامی حجاب کرے۔ اب معلوم نہیں وہ پہلے والے استاذان غلط تھے یا آج کے؟ کیونکہ اگر پہلے والے استاذان غلط تھے تو ان کے کارناموں سے برات کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ افغانوں سے ان پر کیے گئے مظالم پر معافی مانگنی چاہیے اور اگر ایسا نہیں تو پھر موسیٰ کی کہانی میں صرف فرعون مرتا ہے سامری کی موت کی تصدیق کبھی نہیں ہوئی۔

اگر طالبان سیکھ گئے ہیں تو خوش آئند ہے، ثابت کریں۔ لیکن لاہور میں پیدا ہونے

والے محمود غزنوی کب بدلیں گے جو رنجیت سنگھ کے مجسمے تک کو برداشت نہیں کر سکتے؟ جو بامیان کے ہزار سالہ چوکیدار بدھا کو تباہ کرنے والوں کا پیروکار بن کر جہاد پر نکل جانے پر تیار بیٹھے ہیں۔ ان طالبان کا کیسے راستہ روکو گے، جو کابل اور قندھار میں عورتوں پر تشدد کرنے والوں کی طرح عورت کو لاہور کے پارک اور بازار میں برداشت نہیں کر سکتے؟

کیا تاریخ کا پہیہ پھر واپس گھومنے والا ہے؟ کابل میں اپنے ہم خیالوں سے شہ پا کر کیا یہاں کے خوابیدہ مجاہد بھی ذہنی نمو پا رہے ہیں؟ طالبان تبدیل ہوئے ہوں یا نہیں، ہمیں تبدیل ہونے کی اشد ضرورت ہے۔ ساری کہانیوں میں فرعون مرتے ہیں سامری نہیں، سامری کو مارنا ممکن نہ ہو تو نشاندہی ضرور کی جانی چاہیے ورنہ پائیڈ پائپر کی طلسماتی بانسری کے ذریعے کوئی سامری کسی دن ہماری نوجوان نسل کو بھی کسی تاریک غار میں بلا سکتی ہے۔

محمود خان اچکزئی کی تقریر:
سلیم صافی، حامد میر اور سہیل وڑائچ کا متعصب ردعمل

"ہم پنجابی سینٹرل ایشیا کے ہر حملہ آور کا اٹک کے پل پر استقبال کرتے تھے، اسے ہار پہناتے، سپاہیوں کو خوراک اور گھوڑوں کو چارہ دیتے تھے اور سیدھا پانی پت چھوڑ کر آتے تھے، یہ ہماری تاریخ تھی، تاریخ نے ایک بار پلٹا کھایا اور انگریز پانی پت سے لاہور آ گیا، ہم نے اسے بھی ہار پہنائے، اور سیدھا جلال آباد چھوڑ کر آئے، انگریز باقی عمر افغانوں سے لڑتے رہے اور ہم ان کے سہولت کار بنے رہے" جاوید چوہدری کے چھپے ہوئے کالم کے یہ ہو بہو الفاظ ہیں۔

نیشنل یونیورسٹی آف سنگاپور کے پروفیسر ٹان ٹائی یونگ نے جب اپنی کتاب "دی گیریزن سٹیٹ، دی ملٹری گورنمنٹ اینڈ سوسائٹی ان کالونیل پنجاب 1947۔ 1849" چھاپی، تو ایاز امیر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ، مصنف جب یہ کہتا ہے کہ پنجاب ہمیشہ طاقت کے دھن پر ناچتا رہا ہے، تو یہ بالکل سچ ہے۔ کیونکہ ماضی میں بھی ہم نے ہر حملہ آور کی آؤ بھگت کی ہے، اور حال میں بھی ہم نے ہر مارشل لا کو دامے درمے سخنے سپورٹ کیا ہے، جیسا کہ ابھی ہو رہا ہے۔ (مشرف کے مارشل لاء کا دور تھا، جس میں پرویز الٰہی جنرل مشرف کو دس دفعہ باوردی صدر منتخب کرانے کو عین قومی مفاد کہتا تھا)۔ ایاز امیر آگے لکھتے ہیں کہ، پنجاب میں حکومت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے، اس لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے

مختصر دور اقتدار کے علاوہ پنجاب کے پاس اقتدار کا کوئی تاریخی حوالہ نہیں، ثبوت یہ ہے کہ گزشتہ تیس سال سے نواز شریف اور شہباز شریف مختلف صورتوں میں پاکستان پر حکمرانی کر رہے ہیں لیکن کوئی قابل ذکر کردار ادا نہیں کر سکے، ہمارے تیس سال اگر مارشل لاؤں نے ضائع کیے تو تیس سال ان دونوں بھائیوں نے ضائع کئے ہیں، ہم پنجابی ڈیلیور ہی نہیں کر سکتے ورنہ تیس سال کوئی کم دورانیہ نہیں۔ (کالم کا لب لباب یہی ہے جو جنگ اخبار کے کالم آرکائیو میں دیکھا جا سکتا ہے)۔ پنجاب کے سیاسی بانجھ پن کا ذکر ایاز امیر نے بار بار اپنے کالموں میں کرتا رہتا ہے۔

جو کچھ ان دو بڑے پنجابی دانشوروں نے بڑی نستعلیق اردو میں لکھا ہے، وہی محمود خان اچکزئی نے اپنے قبائیلی انداز اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں پی ڈی ایم کے لاہور جلسے میں کہہ دیا۔ جس پر سلیم صافی نے شدید مذمت کی، حامد میر نے ٹویٹ بازیکی اور سہیل وڑائچ نے مخالفتمیں بھرپور کالم لکھا۔ فواد چوہدری نے اسے غدار، ننگ زمین کہکر پنجاب میں ان کے داخلے پر پابندی لگانے کا مطالبہ بھی کیا۔ اس کے علاوہ بڑے دھارے کے ٹی وی چینلز اور پرنٹ میڈیا نے بھی حسب توفیق اپنا اپنا حصہ ڈالا۔

محمود خان اچکزئی نے طعنہ نہیں دیا، شکوہ کیا تھا۔ انہوں نے پنجابی قوم کو غدار نہیں کہا تھا کیونکہ احمد خان کھرل، دلا بھٹی اور بھگت سنگھ جیسے سورماوں کو جنم دینے والی سرزمین کو کون طعنہ دے سکتا ہے؟ انہوں پنجاب کے غداروں کی نشاندہی کی تھی جو ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ غداروں کی نشاندہی پر اتنا شور و غوغا نا قابل فہم ہے۔ محمود خان اچکزئی کون سے پنجاب کے ساتھ کھڑے ہیں؟ وہ تو نواز شریف اور مسلم لیگ نون کے اتحادی اور آئین اور قانون کی حکمرانی کے لئے کوشاں ہیں۔ ممکن ہے اس نے یہ شکوہ نواز شریف سے کیا ہو، جس نے ماضی میں پختونخوا کے نام پر اے این پی کے ساتھ اتحاد کیا اور پھر مکر گیا۔ محمود خان اچکزئی حال کا سیاستدان لیکن تاریخ کا اسیر ہے۔ میں بھی یہی کہوں گا کہ لاہور میں اس کا کیا گیا شکوہ بر محل نہیں تھا، کیونکہ پہلی بار پنجاب کے مطالبات بھی وہی ہیں جو باقی ملک کے ہیں۔

ہر قوم میں موقع پرست اور جاہ پرست ہوتے ہیں، اور پنجاب تو تاریخ کی گزر گاہ رہا

ہے۔ ہر کوئی یہی سے گزرنا چاہتا ہو تو مصلحت کا تقاضا یہی ہونا چاہیے تھا، کہ ہار پہناؤ، کھانا اور چارہ دو، دلی کا راستہ دکھاو اور مزاحم نہ ہو۔ مزاحمت کی صورت میں پنجاب آج لق دق صحرا ہوتا، جس میں آج آرکیالوجی کے ماہرین کھنڈرات اور انسانی کھوپڑیوں پر تحقیق کرتے ہوئے ملتے، نہ تمدن نہ تہذیب نہ شہر نہ باغات اور عمارات، کچھ بھی نہ ہوتا۔ افغانستان کو سلطنتوں کی قبرستان ویسے تو نہیں کہتے ہیں؟ مزاحمت ہی مزاحمت ہے۔ تاریخ میں لاہور کے محاصرے، مزاحمت اور تباہی کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ دلی کے محاصرے ہوتے رہے، مزاحمتیں ہوئیں اور کئی بار لٹا، کیونکہ جنگ میں وہی مرتا ہے جو جنگ میں حصہ لیتا ہے۔ شیر شاہ سوری کی تین خواہشات میں سے ایک خواہش لاہور کی تباہی بتائی جاتی ہے، کیونکہ بقول ان کے، افغانستان سے آنے والا ہر حملہ لاہور میں دم لے کر دلی آتا ہے، لیکن یہ صرف مفروضہ ہے۔

پی ٹی آئی میڈیا مینیج کرنا جانتی ہے۔ جب بھی پی ڈی ایم جلسہ کرتی ہے، پی ٹی آئی اصل تماشے کے کنارے نیا تماشا کھڑا کر دیتی ہے، تاکہ جلسے کی بجائے ان کے کھڑے کیے گئے تماشا پر بحث ہوتی رہے، ماضی میں وہ تماشا کیپٹن صفدر کی گرفتاری ہو، ملتان جلسے کی اجازت نہ دینا ہو، گوجرانوالہ کے راستے بند کرنے ہوں یا پشاور کے جلسے میں ”عوامی استرداد“ کا شوشا چھوڑنا ہو اور لاہور میں ان کو اچکزئی ملے۔ ویسے بھی نون لیگ کے بڑے بڑے عمران خان کو نیازی کہہ کر پکارتے ہیں تو وہ پنجاب کی مبنی بر تعصب، قوم پرستی کو ہی آواز دیتے ہیں۔ تبھی تو محمود خان اچکزئی کو ایک جلسے میں کہنا پڑا کہ ہم یہاں کسی کو گالی دینے یا توہین کرنے کے لیے اکٹھے نہیں ہوئے۔ لیکن ان کی یہ اچھی بات کسی چوہدری، صافی، میر یا وڑائچ صاحب کو اپیل نہیں کر سکی، جس پر وہ بیان دیتے، تعریف کرتے، ٹویٹ کرتے یا کالم لکھتے۔

فواد چوہدری، اپنی پارٹی میں معتدل سوچ کے حامل واحد سیاست دان ہیں، ساتھ قوم پرست بھی ہیں۔ اگرچہ ایسا کرتے ہوئے وہ کبھی کبھی نسل پرستی کی نفرت انگیز وادی میں بھی نکل جاتے ہیں۔ لیکن کمزور قوم پرستی کی یہی مجبوری ہوتی ہے، جہاں قوم پرستی کا جذبہ مفقود ہو وہاں نسل پرستی کرنی پڑتی ہے۔ وہ پنجابی قوم کی تاریخی بحالی اور یکجہتی کے لئے کوشاں ہیں۔ اس لئے جب 'عقل سے عاری' کوئی جوان مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مجسمے کی توہین

کرتا ہے، تو وہ تڑپ اٹھنے کے ساتھ ساتھ محمود خان کی تقریر میں موجود شکوے کو طعنے میں بھی تبدیل کر دیتے ہیں۔ فواد چوہدری صاحب کو قوم پرستی کی خارزار وادی میں ابھی بہت سفر کرنا ہے، کیونکہ دونوں طرف پنجابیوں کے بھائی چارے کے درمیان بارود بھرے خاردار سرحد کے علاوہ لاکھوں لاشیں اور ہزاروں لٹی ہوئی عصمتیں موجود ہیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ہی ہندوستان کو پختونخوا کا تحفہ دیا تھا، اور یہی محمود خان کی سچائی ہے گو کہ مہاراجہ نے کبھی انگریزی فوج پر حملہ نہیں کیا۔ کابل ریزیڈینسی میں انگریز کیلئے قتل ہونے والوں کی یادگار مردان میں ہے، جہاں پر سب پنجابی سورماؤں کے نام سنگ مرمر کے سل پر لکھے ہوئے ہیں۔ جنگ عظیم میں انگریز کی طرف سے لڑنے والوں میں غلام ہندوستان کے بیٹوں میں سب سے زیادہ تعداد بھی پنجاب کی تھی۔

فواد چوہدری صاحب کے لئے قوم پرستی کا ایک اشاریہ مقرر کرتا ہوں، بھگت سنگھ میرا ابھی ہیرو ہے، لیکن جب تک آپ کے بھائی اپنے بیٹوں کے نام سکندر اعظم کے نام رکھیں گے اور راجہ پورس سے نفرت کریں گے، تب تک پنجابوں میں یکجہتی اور قوم پرستی ایک خواب ہے، جس کی قربان گاہ میں آپ جتنے چاہو اچکزئیوں اور نون لیگ والے جتنے چاہے نیازیوں کی بلی چڑھائیں، بے سود ہے۔ آپ کے سینے میں گھٹے ہوئے نعرے لر او بر یو پنجاب کے نکلنے میں ابھی صدیوں کا سفر باقی ہے جبکہ منصور بن کر، اچکزئی، یہ نعرہ ہر دار پر لگاتار ہتا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ وہ آپ کے ہاں غدار اور قابل مقاطعہ، صافی کے ہاں قابل مذمت، میر کے ہاں ٹویٹ بازی کا نشانہ، وڑائچ کے ہاں مخالف کالم لکھنے کا سزاوار، اور صابر شاکر کے قبیل والوں کے ہاں راندہ درگاہ ہیں۔

پختون اور پنجابی نوجوانوں نے مل کر انسانی حقوق، آئین اور قانون کی بالادستی کے لئے ایک ساتھ آواز اٹھائی جس کی پاداش میں پختون اور پنجابی مظاہرین کو پکڑ کر ان پر بلا تفریق غداری کے مقدمات قائم کیے گئے۔ ریاست کے کارپردازوں کی انگریزی حکمت عملی یعنی لڑاؤ اور حکومت کرو، ابھی تک تبدیل نہیں ہوئی۔ جس کی وجہ سے وطن عزیز میں مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کی بجائے خلیج بڑھائی جارہی ہے۔ ایک ایسے

مظاہرے میں، جس میں پنجاب کے بیٹوں پر پختونوں کے لئے آواز اٹھانے کی پاداش میں غداری کے تہمت لگے، جس کی وجہ سے پختونوں اور پنجابیوں کے درمیان موجود تعصبات کا سمندر ایک لمحے میں پاٹا گیا اور باشعور پنجابی نوجوانوں نے پختونوں کی خاطر غداری کے تمغے فخر سے سینوں پر سجائے۔ یقین کریں انسانی حقوق، آئین اور قانون کی بالادستی کے لئے آواز اٹھانے والے پنجابیوں کی تعداد جتنی بڑھے گی، پاکستان اتنا ہی مضبوط ہو گا"۔

فواد چوہدری تو سیاست دان ہیں، قوم پرست ہیں، ان سے کوئی شکوہ ہے نہ سوال ہے، سلیم صافی، حامد میر اور سہیل وڑائچ جیسے مشہور کالم نویس کیسے فواد چوہدری کا ساتھ دینے لگے؟ میر کا کشمیر پنجاب کا ہمسایہ ہے، لیکن وہاں صرف اچکزئی کے بھائیوں کی کھوپڑیاں خاک ہوئیں تھیں، اس کی خاطر انہوں نے ٹویٹ بازی کے بعد پرائشچٹ میں لکھا کہ محمود خان اچکزئی کا باپ غدار نہیں تھا (مطلب وہ خود غدار ہے)۔ لیکن ان تینوں کے سامنے دو اور قابل مذمت، قابل ٹویٹ بازی اور مخالف کالم کے قابل، ایاز امیر اور جاوید چوہدری ابھی موجود ہیں۔ کیا یہ تینوں صاحبان علم و قلم جاوید چوہدری اور ایاز امیر کے خلاف بھی ایسا کریں گے؟ اگر نہیں تو کیوں؟ کیا فواد چوہدری ان دونوں قلم کاروں کے مقاطعے کی آرزو بھی کریں گے؟ یا یہ ملک اور چوہدری ہیں اچکزئی اور نیازی تھوڑے ہیں؟ کیا اس کو نسل پرستی کہتے ہیں؟

سوات میں خوشی پر پرچہ کاٹنے والے

سوات صرف خوبصورت نہیں بہت خوبصورت ہے۔ سواتی پختون، مہمان نواز، مہمان دوست اور پورے پختونخوا میں سب سے زیادہ پر امن اور تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ سوات کے ہوٹل، خوراک اور خدمات مری کے مقابلے میں نہایت سستی اور بہترین ہیں۔ پانی وافر، علاقہ دور دور تک کھلی وادیوں پر مشتمل ہے۔ شفاف اور صحت بخش پانی کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا، ہر طرف بہتے ہوئے چشمے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سوات مری کی طرح تنگ، پیسہ چوس اور گندا نہیں۔

پہلے صوفی محمد کے اسلام کے ذریعے سیاحوں کو سوات آنے سے ڈرا کر منع کیا جاتا تھا، تاکہ دوسرے سیاحتی مقامات کو بزنس ملے، لیکن ہزاروں پختونوں کو افغانستان کے دشت لیلیٰ میں گیدڑوں کی خوراک بنانے کے بعد جب وہ اللہ کے پاس چلا گیا، تب سوات میں امن اور سیاح لوٹ آئے۔ جب ملک بھر سے جوق در جوق بچے بڑے فیملیز سمیت سوات آنے لگے تو ان سیاحوں کو مختلف شکلوں میں چھپے ہوئے طالب اور ان کے ایجنٹ اب دوبارہ ڈرانے لگے۔

سوشل میڈیا پر موجود ایک بے ضرر ویڈیو میں دیکھا جا سکتا ہے کہ پنجاب سے آئے ہوئے یونیورسٹی کے مہمان بچے قریب کہیں بجنے والی موسیقی کے ساتھ سر پیر ہلا رہے ہیں، جس سے ہماری تہذیب اور روایات کی خلاف ورزی ہوئی اور شاید اسلام بھی خطرے میں پڑ

گیا۔ لیکن کون سی روایات کی خلاف ورزی ہوئی، سمجھ نہیں آئی؟ طالبان کی روایات کی خلاف ورزی ہوئی ہو تو ممکن ہے ہوئی ہو مگر پختون روایات کی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔

اس ویڈیو کے ساتھ ساتھ ایک اور ویڈیو بھی سوشل میڈیا پر گردش میں ہے جس میں افغانستان میں کسی شادی کی تقریب میں گانا بجانے والے چند فنکاروں کو دیکھا جا سکتا ہے، جن کے سر گنجے کیے گئے ہیں، منہ پر کالک مل دی گئی ہے اور منہ چھپائے ہوئے طالبان، ان کو گدھوں پر پھرا رہے ہیں۔ ہاں طالبان کی روایات، خوشیاں منانا، خوشی کے موقع پر ناچنا اور گانا نہیں بلکہ مسلمانوں کے خلاف مساجد، امام بارگاہیں اور بازاروں میں خودکش حملے کرنا، مسلمان بھائیوں کے کٹے ہوئے سروں سے فٹ بال کھیلنا، سکول کے بچے ذبح کرنا ہیں۔ لیکن پختونوں کی روایات میں ناچ گانا اور مہمانوں کو سر آنکھوں پر بٹھانا شامل ہے۔ خٹک ناچ کیا امر تسر کے سکھ اپنی خوشیوں کے دوران ناچتے ہیں؟ اتنڑ کیا تل ابیب کی گلیوں بازاروں اور میدانوں میں خوشی سے سرشار یہودی نوجوان مرد اور عورتیں کرتی ہیں؟ پختونخوا میں شادیوں اور خوشیوں کے موقع پر ماتم کیا جاتا ہے ناچ گانا نہیں ہوتا؟ کیا پختونوں کے حجروں (ڈیروں) اور بیٹھکوں میں رباب منگے، ٹنگ ٹکور اور بے خود ہو کر ناچ اٹھنے پر پابندی ہے؟ پھر مالم جبہ میں کون سی آبادی ہے اور کون سا گاؤں بستا ہے جس کے باشندوں کی مقدس روایات پامال کیے گئے؟ یا پھر مالم جبہ خوشیاں ڈھونڈھنے کی تلاش میں آئے ہوئے سیاحوں کی منزل مقصود نہیں کوئی تبلیغی مرکز یا جامع مسجد ہے، جس کی توہین کی گئی ہے، جس پر ایف آئی آر کاٹی گئی۔

آج بھی سوات کے باشندے والئ سوات کے دور کو یاد کرتے ہیں تو اس دور کی کہانی کم سناتے ہیں اور آہیں زیادہ بھرتے ہیں۔ والئ سوات کے انصاف پرور دور کو عمر رسیدہ لوگ آج بھی اسلامی دور کہتے ہیں۔ والئ سوات کے اس اسلامی دور میں پختونخوا بھر میں پشتون فنکاروں کی سب سے بڑی آبادی سوات کے علاقہ بنڑ میں رہتی تھی۔ جہاں کے چناروں اور چلغوزے کے سربفلک درختوں کے بیچ پختونخوا کی خوبصورت ترین عورتیں بولتیں تو لگتا ہے کوئلیں کوکتی، لچکتیں تو شاخ بید لاج سے خشک ہو جانا چاہتی اور تان اٹھاتیں تو بازدرہ میں

مدفون پختون شہید محبت آدم خان کا رباب خود بخود جھنجھنا اٹھتا، جو پختون نہیں جانتا کہ آدم خان کون ہے اور کس وجہ سے مشہور تھا؟ وہ پختون ہے نہ پختون روایات کا امین۔

پختونوں کی خوشیوں کے دشمن اور خوشحالی کے مخالف اب بھی کہیں ارد گرد بہروپ بھر کر موجود ہیں۔ وہ نہیں چاہتے پختون خوش رہے، خوشحال رہے، ناچے گائے، ان سے باہر کے لوگ آکے ملیں، ان کے بارے میں مثبت سوچیں اور روشن روایات پنپیں، وہ دو پیسے کمائے اور دوسری اقوام میں دوست بنائے۔

روایتی پختون معاشرہ مدارج کے افقی ماڈل پر مشتمل ایک قدیم جمہوری وجود رکھتا ہے، جس میں بہت ساری جوہری تبدیلیوں کے باوجود بھی، آج تک بنیادی ڈھانچہ دیکھا جا سکتا ہے۔ جس طرح پختونخوا میں پنجاب کے راستے آنے والے ہر غیر پختون کو پنجابی کہا اور پنجابی سمجھا گیا، اسی طرح پختونخوا کی طرف سے پنجاب آنے والے ہر پشتو بولنے والے کو پختون سمجھا جاتا ہے جبکہ پختون روایات کے تحت مکمل پختون، پشتو بولنے والے صرف اس فرد کو کہا جاتا تھا جس کی جائیداد یعنی زمین ہوتی تھی۔ زمین کے بغیر پشتون ہمسایہ ملاتڑ اور کسی فن (لوہار، ترکھان، کمہار، کپڑا سازی وغیرہ) میں طاق ہونے کی بناء پر کسب گر کہلاتا تھا۔ یہ لوگ زمیندار پشتون کے ہاں رشتے کے اہل نہیں تھے نہ ان کے گھر سے وہاں رشتے لئے جاتے تھے۔ مُلا بھی اسی معاشرتی درجہ بندی کا حامل تھا، جو غیر زمیندار پشتون کے لئے مقرر تھی، البتہ مذہبی فرائض کی ادائیگی کی وجہ سے دوسروں کے مقابلے میں عزت کا تھوڑا زیادہ حقدار تھا، لیکن مکمل پشتون کے برابر تھا نہ اس کی بات کی کوئی اہمیت تھی، البتہ عالم اور خصوصاً وہ جو زمیندار ہوتا، اس کا رتبہ دینی علم اور خاندانی نجابت کی بنا پر باقی زمینداروں کے برابر ہوتا، بلکہ بعض اوقات ان کی بات مذہبی معاملات میں راجح ہوتی۔

جب کبھی قومی یا ملکی اہمیت کے معرکہ میں، فطری پشتون لیڈر، خان یا ملک مر جاتا، جھک جاتا، یا قومی ترجیحات کے خلاف ہو جاتا، تو پھر مولوی کی ثانوی لیڈر شپ علم اٹھا کر قوم کو پیچھے لگا لیتی، لیکن یہ جز وقتی اور اضطراری لیڈر شپ مشکلات ختم ہونے یا حقیقی لیڈر شپ کے دوبارہ ابھرنے پر خود بخود ختم ہو جاتی۔

پختون اپنے لیڈر میں بہادری برابری اور انصاف کے علاوہ، ضرورت کے وقت دستیابی، کھلے ہاتھوں خرچ، کھلا ہوا حجرہ (ڈیرہ) اور پھیلا ہوا دستر خوان بنیادی اور اہم خصوصیات شمار کرتے ہیں۔ جنگ میں بہادری دکھانے کے باوجود مولوی باقی خصوصیات سے ہمیشہ عاری ہوتا اس لیے اس کی تہی دستی اسے درجہ اول کا رہنما بننے نہیں دیتا تھا۔

دہشت گردوں کے نزول سے پہلے اس ساری صورتحال کا اچھی طرح مطالعہ اور بندوبست کیا گیا تھا، اس لیے دہشت گردوں نے خود مختار سوچ رکھنے والے خوانین، ملک، شعور رکھنے والے دانشوروں اور قوم پرست لیڈر شپ کو چن چن کر مارا، سکول بند کیے، جلائے، گرائے تاکہ تعلیم یافتہ آبادی اپنے بچوں سمیت ہجرت کرے اور پھر پیدا کردہ خلا میں اپنے تیار کردہ ملا اور ان کے ساتھ معاشرتی درجہ بندی میں کم رتبہ طفیلی ملا کر مستقل بنیادوں پر خود کو مضبوط کر سکے۔ بندوبست کرنے والے جانتے تھے کہ سید احمد بریلوی اپنے کم تر رتبے (مہاجر) اور نچلے معاشرتی مدارج کے حامل ساتھیوں (ملاؤں) کی وجہ سے مقبول ہو سکا نہ کامیاب، یوں اس ہلاکت خیز بندوبست سے بچنے اور بعض صورتوں میں نفع اور مرتبہ حاصل کرنے کی خاطر کچھ طالب بنے کچھ تبلیغی اور جو ایسا کرنے پر تیار نہیں ہوئے وہ مارے گئے۔

یہ حیران کن امر نہیں کہ جس معاشرے میں ملا درجہ اول کے رتبے میں شمار نہیں ہوتا تھا وہاں پر طالب جیسا طفیلی بننا ایک پختون نے قبول کیا بلکہ طالب ہونا ایک قابل فخر کردار بنا؟ یہ تحقیق طلب مسئلہ ہے کہ کیسے حد درجہ خود مختار پختون قبائلی جوان خود کو طالب کہنے لگا؟

مذہبی کجرویوں میں ایک عام فکری مغالطہ یہ ہے کہ صرف میں حق پر ہوں، بلکہ حق کا نمونہ ہوں، جو میرے جیسا نہیں دکھتا اور میرے جیسا رہن سہن نہیں رکھتا، وہ گمراہ ہے، اس کے علاوہ تاریخ کی گرد آلود شاہراہ پر ارتجاعی سفر اور فکری جمود کو ایمان کی پختگی سمجھنا بھی مذہبی مغالطوں میں سے ایک ہے۔ یہی فکری جمود اور 'راسخ العقیدگی' ہے جو افغانستان میں خوشی کی محفل میں گانا بجانے پر برافروختہ ہو جاتی ہے، سوات میں بچوں کے ناچنے پر

ایف آئی آر کاٹتی ہے، اور مانسہرہ یونیورسٹی میں مدرسہ کا ڈریس کوڈ لاگو کرنا پہلی ترجیح بناتی ہے۔

باعزت اقوام کے فنکاروں کو ساری دنیا جانتی ہے، خواہ وہ مائیکل جیکسن جیسا مجہول الجنس کیوں نہ ہو، وہ اپنے فنکاروں کو ملکہ موسیقی، شہنشاہ غزل، ملکہ ترنم کے عزت بھرے خطابات دیتی ہے اور عزت سے محروم قومیں اپنی فنکار عورتوں کو قتل کرتی ہیں اور مردوں سے داڑھیاں رکھوا کر بستر بند تحریک میں بھرتی کرتی ہیں، دنیا تو ان فنکاروں کی پہلے سے اجڑی ہوئی ہے اس لئے ان کی آخرت 'سنوار دی جاتی ہے'۔ لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ یہ محنت کش یہی سب کچھ صدیوں سے پیٹ کی خاطر کرتے آئے ہیں، آخرت کی خاطر نہیں، کیونکہ سمگلنگ، ڈاکے، چوریاں، ملاوٹیں، نوسربازیاں، سود، بچوں سے زیادتیاں، بہنوں کی حق تلفیاں، بھائیوں کی قتل عام، ملک بھر میں لوٹ مار کر کے بھی اگر ہماری آخرت محفوظ ہے، تو اللہ رحمان ان کو بھی بخشنے پر قادر ہے۔

یہ 'عظیم بت شکن' محمود غزنوی کے دور میں بھی یہی گانا بجانے کا کام کرتے تھے، محمد غوری کے دور میں بھی، ابراہیم لودھی کے دور میں بھی، احمد شاہ ابدالی کے دور میں بھی، اور ارطغرل غازی کے ہم قوم الپتگین، سبکتگین، ایبک اور تغلق کے دور میں بھی یہی کرتے آئے تھے۔

تہذیبیں لاکھوں سال کی آبیاری کے بعد کہیں پھل پھول دینے کے قابل ہوتی ہیں، اگر محمود غزنوی واقعی بت شکن تھا تو پھر ضرور ان کی قریب کی نظر شدید حد تک کمزور تھی، کیونکہ اہرام مصر سے دکھائی دینے والا بامیان کا بدھا اس کو نظر نہیں آیا اور دور دراز پڑے سومنات کے چھوٹے موٹے بتوں پر تیشہ آزمائی کے لئے سترہ کوششیں کیں۔ کج فہموں کو نہ ماضی میں برداشت اور بقائے باہمی کی کوئی مثال نظر آئی جب انہوں نے ہزار سالہ بدھا کو بارود کی نذر کیا نہ حال سے سبق سیکھا جب 'امیر المؤمنین' نے 'مہمان نوازی کی روایات' کی خاطر پورا ملک برباد کروا دیا لیکن مہمان حوالے نہیں کیا، جب کہ سوات میں انہی کے پیرو کاروں نے 'مہمانوں' کے ناچنے کو روایات کی خلاف ورزی سمجھ کر پرچہ کاٹ دیا۔ یہ کج فہمی

اور 'راسخ العقیدگی' ہی ہے جو غزنوی، ابدالی اور غوری جیسے مسلمان بادشاہ اور ان کے ادوار کو اسلامی تسلیم کرتی ہے لیکن ان کے چھوڑے ہوئے بدھا کو کفر سمجھتی ہے۔ غزنوی ہو اور بت شکنی نہ کرے ان کیلئے نا قابل فہم ہے۔

سوات میں بچوں کے تھرکنے پر ایف آئی آر کٹوانے، افغانستان میں فنکاروں کے سر گنجے کر کے منہ کالے کروا کر گدھوں پر پھرانے اور خود منہ نقابوں میں چھپانے اور مانسہرہ یونیورسٹی میں مدرسہ ڈریس کوڈ نافذ کرنے والوں کی تفتیش کروگے، تو وہی نکلیں گے جو گرین چوک مینگورہ میں مسلمان پختون پولیس جوان کی لاش لٹکانے کو اسلامی نظام کہتے تھے۔ یہ بھی ایک طرفہ تماشا ہے کہ اسلام دین فطرت ہے، لیکن باپ مرے تو رونا نہیں اور بیٹے کی شادی ہو تو ناچنا نہیں۔

پنجابی مولوی کی خصوصیات

پنجاب کا مولوی باشعور، غیر تمند، قوم پرست، عزت دار اور اپنی قوم کا ہمدرد انسان ہے۔ وہ اپنی قوم کو ہر وقت محفوظ خوش اور خوشحال دیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے اس لیے وہ اس کو پختون مولوی کی طرح چند پیسوں کی خاطر دوسرے ممالک اور اقوام کے ایجنڈے کے بھینٹ نہیں چڑھاتا۔ وہ اپنی قوم کو شدت پسندی اور شدت پسندوں سے بچانے کے علاوہ انکی اچھی اور بھرپور زندگی گزارنے کا آرزومند ہے اس لیے انہیں زندگی سے بیزار کرکے جنت کے حور و قصور کی لالچ میں بارود بھری جیکٹ پہنا کر دوسرے مسلمانوں کو مروانے نہیں بھیجتا۔

اس نے اپنی قوم کو ان کی اصلی حالت میں رکھا ہے، انہیں کسی اور قوم کی نقالی کی ترغیب نہیں دیتا۔ ان کی غمی خوشیوں میں ان کے ساتھ دیتا ہے، حلال حرام اور جائز ناجائز کی ذاتہ پسند ناپسند سے ان کی زندگی اجیرن نہیں بناتا۔ شادیوں میں ڈھول بجتے ہوں، لڈیاں ڈالی جاتی ہوں، مزارات پر عرس ہوں، قوالیاں ہوں اور موسمی، ثقافتی یا علاقائی میلے ان میں خود بھی شرکت کرتا ہے اور دوسروں کو بھی ترغیب دیتا ہے۔

انٹرٹینمنٹ مثبت انسانی زندگی کا حصہ ہے، جس کے بغیر زندگی بے رونق اور ذہن بنجر ہو جاتے ہیں تبھی پنجابی مولوی دل سے مانتا ہے کہ اسلام دین فطرت ہے، اس لئے باپ کے مرنے پر وہ اپنے مقتدی کو رونے پر گنہگار نہیں ٹھہراتا اور بھائی کی شادی میں بھائی کو ناچنے

سے نہیں روکتا۔ خود بھی کھاتا ہے اور اپنے مقتدی کو بھی کھلاتا ہے۔ اپنی قوم سے چندے جمع کرا کے دوسرے ممالک اور اقوام کو جنگ کے لئے نہیں بھیجتا اور نہ اپنی قوم کو دوسری اقوام سے لڑنے مرنے کی تبلیغ و تلقین کرتا ہے۔

وہ اللہ کے نبی کی پیدائش کا جشن مناتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کے قتل پر غمزدہ رہتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے ساتھ روا رکھے گئے ظلم سے خود کو لاتعلق اور غیر جانبدار نہیں رکھتا۔ معاشرتی اور اقتصادی زندگی میں خود بھی حصہ لیتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو بھی بھرپور حصہ لینے کی تلقین کرتا ہے، صوفی محمد بن کر اپنی علاقائی خوشحالی اور سرگرمیوں کا دشمن نہیں بنتا۔ ساری مشہور مذہبی سیاسی پارٹیوں کے مراکز لاہور میں ہونے کے باوجود بھی اپنے مقتدی کو مذہبی سیاست اور شدت پسند سے دور رکھتا ہے۔

وہ سیاست، ووٹ اور مذہب و مسلک کو ہم معنی بنا کر اپنی قوم کو دھوکہ نہیں دیتا۔ ترقی خوشحالی تجارت کے لئے ہر وقت حاکم وقت کا ساتھ دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا علاقہ اور قوم خوشحال اور تعلیم یافتہ ہے۔ کشمیر کی سرحد پر ہونے کے باوجود وہ اپنی قوم کے بچوں کو وہاں مرنے مروانے بھیجتا نہ اپنی قوم کو بستر پکڑا کر ہفتوں مہینوں اور برسوں دنیا، اقتصاد، گھر بار، غمی خوشی سے کاٹ کر شہروں شہروں ملکوں ملکوں پھراتا ہے۔

وہ کسی اور صوبے میں مقدس مراکز بنا کر اپنا پیسہ تجارت قوت اور وقت وہاں نہیں لگاتا بلکہ کوشش کرتا ہے کہ دوسرے لوگ اس کے علاقے میں پیسہ وقت اور انرجی لگائیں اور وہ اس سے فائدہ اٹھائے۔ اپنے بچوں کے سکولوں کو بموں سے نہیں اڑاتا ہے اور نہ پولیو کے قطروں کی مخالفت کرکے اپنی نسل کو اپاہج بنانے کی کوشش میں شریک ہوتا ہے، کشمیر، افغانستان، اسلامی نظام، خلافت، چندے، لشکریں، خودکش حملہ آوروں کی تیاری، اپنی فوج اور پولیس پر حملے، بالکل پسند نہیں کرتا۔

وہ اپنے مسلک اور پارٹی سے بڑھ کر اپنے ملک اور قوم سے پیار کرتا ہے، وہ ایک سچا پاکستانی ہونے کے ساتھ ساتھ پکا مسلمان بھی ہے، اس لئے اپنے ملک اور مسلک کے درمیان ترجیحات پر بڑا واضح موقف رکھتا ہے، خدائی فوجدار بن کر ملک کو سیدھا کرنے کے لئے

بندوق اٹھاتا ہے نہ فتویٰ دے کر بذاتِ خود خلافت اور جہاد کا اعلان کر کے کسی اور ملک پر چڑھائی کرتا ہے، اس لیے امریکی جنگ میں نہ مرا نہ مارا گیا، نہ ڈرون ہوا نہ گوانتاناموبے کے جیل خانے میں گیا، نہ گھر تباہ ہوا نہ اس کی مسجد جلائی گئی اور نہ ملک دشمنی میں اسے یا اس کے کسی مقتدی کو کسی ایجنسی نے اٹھا کر غائب کیا۔

وہ غیرت مند ماں کا بیٹا ہے اس لئے اس نے پنجابی عورتوں پر سر بازار تیزاب پھینکا نہ گلی کوچوں میں برقعہ نہ پہننے پر ڈنڈے مارے، نہ کسی ہم قوم باپردہ لڑکی کو غیر مردوں کے درمیان میدان میں لٹا کر کوڑے لگائے نہ اپنی قوم کو اتنا بے حس اور بے غیرت بنایا کہ وہ ایسے تماشے دیکھے اور خاموش تماشائی بنی رہے، اس لیے اس کے بازار پر رونق، اس کی قوم خوشحال، پرامن اور سلامت ہے۔ نہ وہ خود بدلا نہ اپنی قوم کو بدلنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی طرح اپنی قوم کو بھی مسلمان سمجھتا ہے نہ ان کو گنہگار سمجھتا ہے نہ اپنے آپ سے کمتر سمجھ اس کو مزید مسلمان بنانا چاہتا ہے۔ اس نے اسلام کی سچی روح یعنی سلامتی کو پا لیا ہے وہ اسلام کو مظلوم یا حملہ آور نہیں سمجھتا اس لئے پنجاب میں ٹی وی سٹوڈیوز، ڈرامے، فلمیں، اداکار، گلوکار، موسیقی، فنکار، سینمائیں، مشاعرے، کلچرل تقریبات، میلے عرس، ثقافتی ناچ گانا، فیشن، کھیل تماشے سب جاری ہیں۔ آپ کے ذہن میں جھنگوی، لکھوی، مسعودی، اور حافظ جی کے نام ہڑبونگ مچاتے ہونگے لیکن وہ دوسرے لوگوں کیلئے ہیں، پنجاب کے نمائندے نہیں ہیں۔

افغانستان میں امریکی شکست اور ہماری جیت

افغانی بڑے ''نمک حرام'' ہیں، لیکن امریکہ کو شکست دینے کے بعد ہمیں اپنے اپنے سے لگنے لگے ہیں۔ جنگ امریکہ کی اکانومی، جمہوریت نظام حکومت، اور فوجیں بھیجنا اور نکالنا صدارتی انتخابات کا ایجنڈا ہوتا ہے۔ ایک امریکی صدر کسی ملک کو امریکہ کا دشمن بنا کر سیدھا کرنے کے لئے وہاں فوج بھیجتا ہے، جس کی وجہ سے وہاں کے کارخانے چلنے لگتے ہیں، روزگار مل جاتے ہیں، کنٹریکٹ لئے اور دلا دیے جاتے ہیں اور وہ الیکشن جیت جاتا ہے۔ دوسرا آ کر جنگ کو ختم کرنے اور وہاں سے اپنی فوج کو بحفاظت نکال لانے کے لئے کمپیئین شروع کر دیتا ہے، یوں وہ فوج واپس بلا کر الیکشن جیت جاتا ہے۔

سادگی اور خوش فہمی میں افغانوں اور امریکیوں میں کوئی فرق نہیں، سوائے اس کے، کہ امریکی اپنی جان کی قدر کرتے ہیں اور افغانی نہ اپنی جان کی پرواہ کرتے ہیں نہ کسی اور کی۔ ایک بات اور بھی ان میں مشترک ہے، دونوں کو امن کی نہیں فتح کی خواہش ہوتی ہے۔ دنیا کہتی ہے زندگی ایک دفعہ ملتی ہے، احتیاط کریں۔ افغان (پشتون) کہتے ہیں، موت نے ایک بار آنا ہے۔ اسے زندگی سے کوئی پیار ہی نہیں، یا شاید اسے پیار کی زندگی کبھی ملی ہی نہیں۔ ایسی فتح افغانوں اور ان کو لڑا کر تجوریاں بھرنے والوں کو روس کے خلاف بھی ملی تھی، جب روس نہیں رہا تو پھر آپس میں لڑے کہ لڑنے کے علاوہ کچھ آتا نہیں تھا۔ روس نے افغانستان میں ہسپتال بنائے تھے، پل اور سڑکیں بنائی تھیں، ائیرپورٹ، جدید طیارے،

میزائل اور جدید تعلیمی نظام چھوڑا تھا، لیکن افغانوں کی آپس کی لڑائی میں انہوں نے کابل قندھار اور مزار شریف جیسے تاریخی شہروں کے ساتھ ساتھ وہ سب کچھ تباہ کر دیا۔

آغا جان، نبی محمدی کا فیلڈ کمانڈر تھا سیکنڑوں جوانوں کو لیڈ کرتا تھا۔ جہاد کے بعد ایک دن میں نے اسے میزان چوک کوئٹہ میں فٹ پاتھ پر چادر پھیلائے دیکھا، حالت پوچھی، تو چادر ہٹا کر گھٹنوں کے قریب کٹی ہوئی اپنی دونوں ٹانگیں دکھائیں، میں ششدر کھڑا رہ گیا، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والا آغا جان زندگی سے ڈر رہا تھا۔ اس کے سامنے پھیلی ہوئی چادر میں کسی نے سکہ پھینکا، اس نے اٹھا کر مجھے دکھایا اور سوال کیا، کہاں ہے وہ جنت جس کا آپ وعدے کرتے تھے؟

نظیف جبل السراج کے قریب قلعہ موسی کا باشندہ تھا اور پرانا مجاہد تھا، لیکن طالبان کے نزدیک قابل گردن زدنی تھا اس لئے افغانستان میں طالبان کی پہلی حکومت کے دوران مردان میں قہوہ بیچ کر اپنے بچے پالتا رہا۔ امریکہ کے ہاتھوں طالبان کی شکست کے بعد ایک دن اسے قہوے کی تھرموس کے سامنے روتے ہوئے دیکھا تو نے اس سے میں رونے کی وجہ پوچھی، کہنے لگا کہ جس حاجی صاحب سے قہوہ کی پتی خریدتا ہوں، اس نے گالیاں دے کر بے عزتی کر دی۔ میں نے پوچھا کیوں؟ اس نے بتایا کہ کابل میں سینما دوبارہ کھل جانے پر حاجی صاحب نے مجھے بے غیرت اور کافر کہہ کر گالیاں دیں۔ کابل تو افغانستان کا دارالحکومت ہے۔ آپ کے اس چھوٹے سے شہر میں چار سینمائیں ہیں، لیکن آپ لوگ بے غیرت ہو نہ کافر۔ داڑھی پر بہنے والے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے بتایا کہ میں زمیندار تھا، میرے اپنے بادام اور انگور کے باغات تھے۔ میرے ڈیرے میں گھریلو بنے ہوئے مربوں کے چاٹئی (بڑے مٹکے) سال بھر، بھرے ہوئے پڑے ہوتے، ذبح شدہ بکرا یا دنبہ لٹکا ہوتا، میرا گھر پہاڑ کے اوپر تھا، نیچے دریا کے ساتھ ساتھ پیدل سفر کرنے کا راستہ تھا، کھانے کے وقت میں زبردستی مسافروں کو اوپر بلا کر کھانا کھلاتا اور پھر قہوہ پلا کر رخصت کرتا۔ روس کے نکل جانے کے بعد میں نے مسلمان کے خلاف کبھی بندوق نہیں اٹھائی، دو پاکستانیوں کو ایک لوکل کمانڈر کی جیل سے فرار کروانے میں مدد دی، پہلے اس کمانڈر کی ڈر کی وجہ سے کابل منتقل ہوا، پھر

طالبان کی وجہ سے یہاں آیا، لیکن بڑی لعنت یہ نہیں ہے، کہ آپ ہمیں کافر اور بے غیرت کہتے ہیں بڑھی لعنت یہ ہے کہ میں اپنے ملک میں مسافروں کو زبردستی اپنے ڈیرے پر کھانا کھلایا کرتا تھا، لیکن اب قہوہ پلا کر اس کے پیسے لیتا ہوں، کیا جہاد کا پھل یہی ہے؟

اور اب امریکہ کو شکست ہوئی ہے۔

طالبان کو کہا گیا تھا، اسامہ حوالے کرو، اور القاعدہ کو ملک سے نکالو، بات ختم۔ انہوں نے اسامہ کو حوالہ کرنے اور القاعدہ سے تعلق توڑنے سے انکار کیا، برسوں سوجوتے اور سو پیاز کھانے کے بعد اب القاعدہ کے ساتھ تعلق سے انکار کیا، اچھا نہ ہوتا کہ صحیح وقت پر سفارت کاری کی نزاکتوں کو سمجھتے اور اپنے استادوں کی نہ مانتے، اسی وقت القاعدہ کے ساتھ تعلق سے انکاری ہو جاتے تو لاکھوں افغان مرتے اور نہ میدان جنگ میں اتنے سال ضائع ہوتے۔

اسامہ تو حوالہ ہو گیا انہوں نے نہیں کیا تو کیا ہوا؟ گوانتونامو اور باگرام کے انسانیت سوز اذیت خانوں میں پختونوں کے ساتھ طالبان کی "جذبہ ایمانی" اور "مومنانہ فراست" کی وجہ سے کیا ہوا؟ شادیوں کے جنج اور جنازے ڈرون کر دیے گئے۔ اگر یہی اٹھارہ سال بعد کرنا تھا تو اس وقت کیوں نہیں کیا جب سب کچھ ان کے اختیار میں تھا؟ کہتے ہیں جو مکا لڑائی کے بعد یاد آ جائے، وہ اپنے منہ پر مارنے کے قابل ہوتا ہے۔

جو "مجاہدین" سمجھتے ہیں ہماری جیت ہوئی ہے، ان کو مزید پروپیگنڈے سے اجتناب کرنا چاہیے، ایک مسلمان کو دس کافروں کے برابر بتایا گیا ہے، اگر جیت ہوئی ہوتی تو چوبیس سو امریکی مرے ہیں، اپ کے دو سو چالیس ساتھی مرنے چاہیے تھے۔ یہاں تو شمارہ الٹا ہے، ایک طرف لاکھوں بے کس، لاچار، کم علم، بے سہارا مسلمان ہیں اور دوسری طرف دنیا جہاں کی ٹیکنالوجی اور بارود۔ ہر آفت اس سرزمین پر نازل کی گئی۔ ہر اسلحہ یہاں ٹرائی کیا گیا۔

ڈرون کیمروں کے ذریعے انسانوں کو مارنے کی لائیو سٹریمنگ دنیا بھر کو دکھا کر اپنی ٹیکنالوجیز کی مارکیٹنگ کی گئی، جس کے لئے زندہ انسانوں کو بلا تفریق تجرباتی چوہوں کی طرح استعمال کیا گیا۔ طالبان پروٹو ٹائپ تھے، تخلیق کرنے کے بعد ان سے اپنے بھائیوں کو، ان کیمرہ ذبح کرنے، باردوی جیکٹیں پہنا کر مسلمانوں کے درمیان اڑانے اور ان کی کمی بیشیاں جانچنے کے بعد، ان کا اپ گریڈ ورژن داعش میدان میں اتارا گیا۔ اب ان کو پہلے مطلوبہ علاقے میں اتار کر مخالفین کو تہس نہس کیا جاتا ہے، پھر حالات مناسب پا کر خود امن کے نام پر قبضہ کرتے ہیں۔ شام کی مسلمان بچیاں بلجئیم ہالینڈ رومانیہ اور یونان کی گلیوں میں سر شام کس لئے کھڑی ہوتی ہیں؟ فاتحین کو معلوم کرنا چاہیئے۔ پشتون کے بارے میں انگریز تصدیق کرتے تھے کہ یہ خیرات نہیں مانگتا محنت مزدوری کرتا ہے۔ لیکن آج کابل پشاور قندھار اور جلال آباد کی تندوروں کے سامنے خیرات نہ مانگنے والے مغرور پشتونوں کی عورتیں دامن پھیلا کر روٹیاں مانگتی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو، تو کہاں ہے فراست یا مومن؟ کب تک پرائی لڑائیاں لڑتے رہو گے؟ کیا آپ نے یقین نہیں کہ ایک شہید دس بندوں کی شفاعت کا باعث ہو گا؟ آپکے تو ایک ایک گھر میں دس دس شہید ہوئے ہیں، آپ تو اس دنیا میں جنتی ہیں، کافی ہو گیا، خود بھی جیئے، دوسروں کو بھی جینے دے۔

دوحہ معاہدہ امریکہ کو اختیار دیتا ہے کہ وہ طالبان پر نظر رکھے کہ وہ معاہدے پر عمل درآمد کرتے ہیں یا نہیں؟ ساتھ ساتھ یہی معاہدہ طالبان کو پابند بناتا ہے، کہ وہ تشدد کی کارروائیاں نہیں کریں گے، غیر ملکی دہشت گرد اپنے ملک میں نہیں چھوڑیں گے اور دوسرے سٹیک ہولڈرز سے مذاکرات کریں گے۔ مطمئن ہونے کی صورت میں پھر امریکہ افغانستان سے چودہ مہینے بعد اپنی فوج نکالے گا۔ امریکہ نے طالبان کو تسلیم نہیں کیا طالبان نے امریکہ کو تسلیم کر لیا ہے؟ کیونکہ امریکہ افغانستان میں رہے گا طالبان امریکہ میں نہیں؟

چلیں آپ جیتے ہیں، بس اتنا کریں کہ روس کی طرح امریکہ نے بھی افغانستان میں نظام حکومت، سڑکیں، پل، ہسپتال، کالجز، ایئرپورٹس، جہاز، ٹینک، میزائل، ڈاکٹرز، انجنئرز

اور پروفیسر چھوڑے ہیں۔ آپس کی لڑائی میں ان کو پہلے کی طرح تباہ نہیں کرنا۔ برطانیہ کے جانے کے بعد ان کی بنائی ہوئی سڑکیں، نہریں، ریلوے نظام، عدالتیں، یونیورسٹیز اسی طرح پاکستان میں قائم ہیں، پاکستانی ان سے مستفید ہو رہے ہیں۔

حکومت، مولوی اور خواجہ سرا

مولوی کو مالی مشکلات درپیش ہوں تو گاؤں کے بڑے چودھری کے گھر کسی سانحے کی بد دعائیں مانگنے لگتا ہے۔ چوں کہ مالی مشکلات اسے اکثر ہوتی ہیں اس لیے وہ ایسا کرتا رہتا ہے، وہ مریض کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی حوصلہ شکنی اور دم وم کی حوصلہ افزائی بھی اس لئے کرتا ہے کہ مریض بچ گیا تو محنتانہ سمیت شہرت بھی ملے گی، اور گزر گیا اور مال دار ہوا، تو پانچوں گھی میں۔ وہ، خواجہ سرا کی طرح نہیں ہوتا، جس کی رزق چودھری کی خوشیوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ تبھی تو خواجہ سرا اپنے لئے نہیں چودھری کے گھر کے لئے خوشیاں مانگتا ہے، مولوی اور خواجہ سرا کی مالی منفعت چودھری کے گھر کے غم اور خوشی سے وابستہ ہوتی ہے اس لیے چودھری سے مولوی اور خواجہ سرا کا ایک طرح کا مشترک ناتا ہوتا ہے۔ سانحوں کی منفعت پر مولوی کی اجارہ داری ہے البتہ خوشیوں میں خواجہ سرا اس کا شریکِ منفعت ہوتا ہے اس لیے خواجہ سرا کسی کی خوشی میں ناچ ناچ کر مر بھی جائے، برا ہی ہوتا ہے۔

مرگ انبوہ شاید بہت بڑے انسانی سانحے کو کہتے ہیں۔ تاریخ کی کتب میں بڑے انسانی قاتلوں کو اکثر فاتح اور بادشاہ لکھا جاتا ہے، فاتحین اور بادشاہوں کے علاوہ انسانی جانوں کی بڑی دشمن وبا ہوتی ہے لیکن وبا سب انسانوں کی دشمن نہیں ہوتی۔ جس طرح خوشیوں کے موسم میں خواجہ سرا ناچ ناچ کر بے حال ہو جاتے ہیں لیکن اداس نہیں ہوتے اسی طرح وبا کے دنوں میں گورکن قبریں کھود کھود کر چور ہو جاتے ہیں مگر اداس نہیں ہوتے، کیوں کہ

اداس ہو کر جی ہار بیٹھے، تو بھوکے مر جائیں گے۔ گھوڑے اور گھاس کی دوستی نہیں ہو سکتی۔

گورکن بھی دوسروں کی خوشیوں میں ڈھول بجانے والوں جیسا ہوتا ہے۔ جس طرح ہر کسی کی خوشی میں ڈھول بجانے والے کی اپنی بیٹی کی شادی ہو تو اس کے یہاں کوئی ڈھول بجانے والا نہیں آتا اسی طرح ساری عمر چودھریوں کی قبریں کھودنے والے گورکن کی قبر کھودنے کے لئے کوئی چودھری نہیں آتا۔ وبا کے دنوں میں گورکن بھی مولوی جیسا ہو جاتا ہے۔ جتنی زیادہ اموات، اتنی زیادہ قبریں، اور جتنی زیادہ قبریں اتنی زیادہ منفعت۔ جیسے جتنی زیادہ اموات، اتنے زیادہ جنازے، فاتحہ، تیجے اور چالیسویں یعنی منفعت ہی منفعت۔ یوں گورکن اور مولوی دونوں ہم پیشہ اور شریکِ منفعت بھائی ہیں۔ تبھی کسی نے مولوی سے گورکن کی برائی نہیں سنی ہو گی کیونکہ گورکن مولوی کے تماش بینوں کے لئے پنڈال سجاتا ہے، خواجہ سرا کی طرح اس کے تماش بین نہیں چراتا، تماش بین چرانے کا جتنا سیاست دان برا مانتا ہے اتنا مولوی بھی۔

وبا کے دنوں میں خواجہ سرا سہا اور افسردہ ہوتا ہے۔ سہا اس لیے کہ اتنے نیک اور متقی لوگ اتنی زیادہ تعداد میں مرتے ہوتے ہیں ایسے میں خواجہ سرا مر گیا تو کون نہلائے گا، کون جنازہ پڑھائے گا اور کون دفنائے گا؟ کیونکہ وبا کے دنوں میں مولوی سانحوں کی دعائیں مانگتا ہے نہ گورکن فارغ ہوتا ہے۔ جس پیشے پر بھی بہار آ جائے اس کے ماہرین کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔ ڈاکٹروں کو دیکھیں، کیسے اپنے جاں بلب مریضوں کو ہفتوں اور مہینوں بعد تک معائنے کی تاریخیں دیتے رہتے ہیں، ایسے میں کوئی مریض جلد بازی دکھاتے ہوئے مرا تو اس کی بلا سے۔

وبا کی وجہ سے لوگ یکے بعد دیگرے مرنے لگتے ہیں تو ان پر پس ماندگان روتے نہیں بس سہمے سہمے سے ہوتے ہیں۔ وبا کے دنوں مرحومین کے لئے بخشش کی دعاوؤں کی بجائے پسماندگان اپنے تحفظ کی دعائیں زیادہ مانگتے ہیں۔ وبا کے دنوں میں مرنے والوں کے ساتھ ان کی محبتیں بھی مر جاتی ہیں کیونکہ محبت عام چیز ہے صرف عام دنوں میں ہی کی جاتی ہے۔ تبھی تو وبا کے دنوں میں لوگ وبا سے مرتے ہیں اور گل فروش بھوک سے، کیونکہ محبت

مر جائے تو پھول خرید کر قبروں پر کون ڈالتا ہے؟ جس کی سے مرنے والوں کی قبروں کی مٹی پھولوں کے انتظار میں خشک ہو جاتی ہے، ایسے دنوں میں گل فروش اپنی بد قسمتی روتا ہے البتہ مولوی اور گورکن کی طرح کفن فروش کا کاروبار خوب چمکنے لگتا ہے۔ انسان بھی عجیب ہے، زندہ ہو تو پانچ گز کپڑا درکار ہوتا ہے، مر جائے تو چالیس گز کا، جب کہ زیادہ کپڑوں کی زیادہ ضرورت زندوں کو ہوتی ہے۔ آج جس طرح موت کے کاروبار پر مولوی کی اجارہ داری ہے، پچھلے زمانوں میں اس کے ساتھ ساتھ بزازی بھی وہی کرتا تھا اس لیے مردے کو کتنے کپڑے کی ضرورت ہے، طے ہو چکا ہے۔

اقتدار کے سینے میں دل نہیں دماغ ہوتا ہے، دماغ تو ایسے ہی بنیا ہے سود و زیاں میں لگا رہتا ہے، عاشق تھوڑی ہے نہیں کہ محبت کرے۔ تبھی دماغ محبت میں دُکھتا ہے دھڑکتا نہیں اس لئے اقتدار کا دماغ محبت بھرا نہیں خواہش بھرا ہوتا ہے اس لئے قتدار کی خواہش، اقتدار کو محفوظ، طویل اور دوامی بنانے کی ہوتی ہے۔ یہ خواہش کبھی نہیں چاہتی کہ مارچ آئے تو کوئی مارچ بھی ہو۔ اقتدار کی خواہش، سانحوں کو منافع بخش مواقع (اپرچونٹیز) میں تبدیل کرنا چاہتی ہے۔

جب ہمارے ہمسایہ ملک میں کوئی سانحہ ہو جاتا ہے تو اقتدار کا دماغ سوچتا ہے کہ اگر ایسا سانحہ میرے یہاں ہو، تو اس سے کیا سیاسی منفعت حاصل کی جا سکتی ہے؟ کیا اس سے مہنگائی اور بے روزگاری کے ہاتھوں تنگ اور بے چین عوام کی توجہ حکومتی نا اہلی اور عدم کارکردگی سے ہٹائی جا سکتی ہے؟ حزب اختلاف کو حاصل ہوتی ہوئی اتحاد کو پارہ پارہ کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس سانحے کو کسی بارڈر سے اپنے یہاں لایا جا سکتا ہے؟ کیا کسی اجتماعی کوشش سے ملک میں پھیلایا جا سکتا ہے؟ کیا اپنے مخالف کے مخالف فرقہ یا مسلک کے کسی مفتی یا مولوی کے ذریعے اس کو مزید طول دیا جا سکتا ہے؟

جب اقتدار کا دماغ خود کو محفوظ اور دوامی بنانے کے لئے فیصلہ کرتا ہے تو کسی بارڈر سے سانحے کو اندرون ملک لانے کے لئے صرف بخاری کی ضرورت پڑتی ہے اور اسے اجتماعی کوشش سے پھیلانے کے لئے کسی طارق جمیل کافی ہے، اسے مزید قابل قبول بنانے کیلئے مفتنہ

بھی دستیاب ہیں۔

سانحے کو اپر چونیٹی میں تبدیل کرنے کی خواہش ہو تو تذبذب، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنا، میٹینگیں، کمیٹیاں، مونیٹرنگ، غور و فکر اور سانحے کو ختم کرنے والوں پر مشیروں اور وزیروں کے زبانی کلامی حملوں کے سائن بورڈ جلتے بجھتے رہتے ہیں۔ اس لئے جو ابھی تک سوچتے ہیں، فیصلہ نہیں کر سکے وہ سیاست کرتے ہیں، اور سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ اقتدار کا کوئی رشتہ دار بھی نہیں ہوتا اس لیے وہ قوم کو عوام سمجھتا ہے۔ یعنی عام، معمولی لوگ، جو کثرت میں ہونے کی بجائے وبا کے دنوں میں کثرت سے مرتے ہیں۔ جن کے مرنے پر گورکن، کفن فروش، تابوت فروش اور بعض مولویوں کی خوشیوں کا دار و مدار ہے۔

وبا سے پہلے خواجہ سرا خوشی میں ناچ رہے تھے اور مولوی سانحوں کی بد دعائیں مانگ رہے تھے۔ اب خواجہ سرا سہمے اور افسردہ ہیں، جب کہ مولوی حکومتی اقدامات کے پر پرزے اڑا رہے ہیں، خوش اور خوش حال ہیں، فارغ نہیں ہیں۔ اس لئے کیوں نا اس دفعہ خواجہ سراوں کے سب سے زیادہ متقی کی اقتدا میں ان کی صفوں میں بیٹھ کر، ان کے ساتھ دو رکعت نمازِ تحفظ پڑھی جائے، اور رحمان و رحیم سے گڑ گڑا کر اپنی غلطیوں، کوتاہیوں، گناہوں، جرائم اور مظالم کی معافیاں، اور اس وبا سے تحفظ کی دعائیں مانگی جائیں کیونکہ ہماری خوشیوں سے خواجہ سراوں کی خوشیاں اور رزق وابستہ ہے۔ وبا اسی طرح جاری رہی تو ہم مرتے رہیں گے اور ہم مرتے رہیں گے تو افسردہ اور بے چارے خواجہ سرا بھوکے مر جائیں گے، گل فروشوں کی طرح۔ اس لیے خواجہ سراوں اور گل فروشوں کی زندگی کی خاطر دو رکعت نمازِ امن کی اجازت چاہیے۔

تحریک بستر بند اور تحریک بارودی جیکٹ

تحریک ترک دنیا جسے تحریک بستر بند بھی کہا جاتا ہے، اور تحریک طالبان بظاہر دو الگ الگ تحاریک ہیں، لیکن مقاصد، اہداف اور نتائج میں دونوں یکسو یکساں اور یک زباں ہیں۔ اول الذکر دنیاوی کام کاج، گھریلو ذمہ داریوں، روزگار، خاندانی اور عائلی حقوق وفرائض، معاشرتی اعمال اور ثقافتی رنگارنگی سے کنارہ کشی اور کنی کترانے کی ترغیب اور تحریص دلاتی ہے، تو تحریک طالبان دنیاوی ضروریات و حاجات، ماں باپ بہن بھائی اور بیوی بچوں کے فرائض سے آپ کو مبرا قرار دے کر بارود بھری جیکٹ پہناتی ہے، جنت اور وہاں کی حور و قصور کا نشہ دلا کر زندگی اس کی خوبصورتی اور امتحانات سے ایک دم آزاد کراتی ہے، دونوں آپ کو دنیا اور اس کی آلائشوں سے پاک کرتی ہیں، ایک جیکٹ پہنا کر جنت بھیجتی ہے اور دوسری آپ کو ایک بستر، دو جوڑے کپڑے اور سال کی زاد راہ گھر سے لے جانے کی اجازت دے کر جنت کے حصول مین جوتتا ہے۔

جیکٹ والا بھی نہیں سوچتا کہ جب وہ پرزہ پرزہ ہو کر جنت پہنچ جائے گا تو اس کی بیوی اور بچے زندگی کا جہنم کون سے ایندھن سے گرم کریں گے اور ترک دنیا والے بھی بستر اٹھانے کے بعد نہیں سوچنے نہیں دیتے کہ گھر چھوڑ جانے کے بعد اس کی جواں بیوی کے بشری ضروریات، بیمار بچے کی دوا، اور تعلیم و تربیت کا کیا ہو گا؟ جس ماں کے قدموں میں جنت تھی اس کو چھوڑ کر وہ کون سی جنت کو کمانے نکلتا ہے؟ بوڑھا باپ جو چند دن کا مہمان ہے

جس کے اس پر قدم قدم اور سانس سانس ڈھیروں احسانات ہیں جو اسے دیکھ کر جیتا ہے، اس بوڑھے کے بے پناہ حقوق اس بیٹے نے ادا کرنے تھے لیکن یہاں اللہ کی راہ میں نکلے ہوئے ایک نیک بندے کو سوڈان میں اطلاع ملتی کہ اللہ نے بیٹا دے دیا، اٹھارہ سال بعد جب وہ دوبارہ سوڈان میں تھا تو اطلاع ملتی ہے کہ آپ کا بیٹا اللہ کے پاس چلا گیا، اللہ اللہ کیا شان ہے، سبحان اللہ۔

کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ اللہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے مشہور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم یا کم از کم عشرہ مبشرہ کب کب اور کتنے مہینوں کے لئے اپنے بچے اور مدینہ چھوڑ کر باہر کے شہروں اور ملکوں میں تبلیغ کی عرض سے تشریف لے گئے تھے؟ صحابہ کاشتکار اور تاجر تھے، زکوٰۃ دیتے تھے اور کئی کئی شادیاں کیں تھیں،(یہاں ایک شادی سے جان چھڑائی جا رہی ہے)۔ جن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی قبریں دنیا بھر میں پھیلی ہوئیں ہیں، وہ یا جہاد میں ساتھیوں کے ساتھ شہید ہوئے یا سرکاری فرائض کے سلسلے میں تشریف وہاں لے گئے اور بہت سارے واقعہ حرا کے بعد مدینہ چھوڑ کر جان اور دین بچا گئے۔ ایسا کوئی صحابی نہیں جو سالوں بعد تبلیغ سے واپس گھر آئے اور بچے کو نہیں پہچانتا تھا۔ حضرت عمر کے پاس ایک صحابیہ شکایت لاتی ہے کہ اس کا شوہر رات بھر تہجد اور دن بھر روزے رکھتا ہے اور اس کی بشری تقاضوں کا خیال نہیں رکھتا۔ تو انہوں نے شوہر کو بیوی کی بشری ضروریات کا خیال نہ رکھنے پر سرزنش کی، آج عمر (رض) ہوتے تو لگ پتہ جاتا کیونکہ انہوں نے تو محاذ جنگ پر شادی شدہ مجاہد کے لئے تین مہینے کے بعد چھٹی کا قانون بنایا تھا۔

جیکٹ اور بستر بند والوں کے اہداف بلکل مشترکہ اور ہم آہنگ ہیں اور وہ پختون اور پختونخوا ہیں۔ ایک سکول کالج یونیورسٹی پر حملے کرتا ہے تو دوسرا وہاں کی تعلیم سے نفرت دلاتا ہے، ایک بازار میں پختونوں کو مارتا ہے، دوسرا کہتا ہے یہ آپ کے اعمال کی وجہ سے ہوتا ہے یعنی قاتل بے گناہ ہے، ایک اس کے بچوں اور بھائیوں کو سکولوں اور بازاروں میں بموں سے اڑاتا ہے اور دوسرا کہتا ہے کوئی کوئی پتا بھی اللہ کی مرضی سے نہیں ہلتا یعنی قاتل اپنے کئے کیلئے ذمہ دار نہیں۔

ایک پختون عرب کی چلچلاتی دھوپ میں غیر انسانی حالات میں مزدوری کرتا ہے اور دوسرا ان پیسوں پر کوئی روزگار کرنے اور مسافر بھائی کے بچوں کی نگہداشت اور تربیت کرنے کی بجائے سالہا سال سے گھر سے باہر رہتا ہے اور دلیل بھی یہی دیتا ہے کہ جب بندہ برسوں غیر ممالک میں مزدوری کرتا ہے تو اس کی بیوی کا کوئی حق نہیں ہوتا؟ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ نو حصے رزق تجارت اور ایک حصہ رزق باقی کاموں میں ہے، سال میں دو دفعہ لاہور میں اکٹھا ہونے کی صورت میں اگر دس لاکھ پختون ان دنوں میں تین ہزار روپے کا خرچہ کرتے ہیں تو لاہور کو سالانہ چھ ارب روپے کا بزنس دیتے ہیں۔ ایک طرف بریلوی داتا صاحب پر دن رات چڑھاوے چڑھاتے ہیں تو دوسری طرف دیوبندی رائیونڈ شریف پر سالانہ اربوں نچھاور کرتے ہیں۔ لاہور کی شکل بدل گئی، آبادی کراچی سے بڑھ گئی، اکانومی پورے پاکستان میں تیزی سے ترقی کر رہی ہے، اورنج ٹرین، میٹرو، معاشی اور معاشرتی زندگی لبالب اور چھلکنے کو تیار، فرق نہیں پڑا تو فلمی سٹوڈیوز کو، ڈرامہ کمپنیوں کو، ناچنے والیوں اور جسم فروش بازاروں میں جسم بیچنے والیوں کو اور میلے ٹھیلوں کو۔ جبکہ دوسری طرف پختونخوا بدل گیا۔ چھوٹی شلواریں لمبی داڑھیاں، گرے ہوئے سکول، زخمی والدین، یتیم بچے، جلے ہوئے بازار اور دنیا بیزار لوگ۔ پوچھو کہ ایسا کیوں ہوتا ہے تو جواب آئے گا کہ ایمان کمزور ہے۔ بھئی ایمان صرف پختونوں کا کیوں کمزور ہے؟ عرس میلہ ثقافتی تقریبات تو چھوڑیں، یہاں تو رحمان بابا جیسے صوفی شاعر اور انسان دوست درویش کی قبر بھی نہیں بچی، یہاں پر اللہ کا تخلیق کردہ خواجہ سرا بھی مارا جاتا ہے، مرد فنکاروں اور ہنرمندوں کو ایک تحریک نے بے روزگار کیا اور دوسری نے داڑھیاں رکھنے پر مجبور کیا، پیٹ کی آگ اور بدکردار ماضی سے چھٹکارا پانے کی نیت نے بستر پکڑا دی، ناچنے گانے والیاں علاقہ اور صوبہ چھوڑ کر جسم فروشی کے پیشے سے منسلک ہو گئیں، اور جو ایک دو ڈرامے کے نام پر رہ کہیں مصروف ہیں، ان کی لاشیں گنے کی کھیتوں اور کچرے کی ڈرموں سے تسلسل سے مل رہی ہیں۔

پختون معاشرے کو نارمل معاشرہ بنانے کے لئے بستر بند تحریک اور دوسرے دنیا بیزار تحرکات سے نکالنا ہوگا، اللہ نے زندگی دی ہے تو زندگی سے لطف اندوز ہونے کا احساس

اور موقع دیناہو گا، جس طرح باقی پاکستانی نماز روزے اور روز گار کرتے ہیں، بچوں اور گھر ون کا خیال رکھتے ہیں، پختونوں کو بھی مذہب کی اتنی ہی ضرورت ہے نہ کم نہ زیادہ، ان کو مزید مسلمان بنانا مستقبل میں بدترین نفسیاتی، اقتصادی، اور روحانی امراضِ کا باعث بنے گا۔

پختونخوا میں اکثریت ہونے کے باوجود دیوبندیوں کی مرکز لاہور ہے، لیکن اس تحریک کے سارے سیلیبریٹیز غیر پختون ہیں تاہم جب بھی پختونخوا میں رمضان اور عید کا چاند نظر آتا ہے تو یہی دیوبندی مذہبی سیلیبریٹیز پنجاب کے بریلویوں کے ساتھ عید اور روزہ رکھتے ہیں، پشاور کے پختون دیوبندیوں کے ساتھ نہیں۔

حضرات، حاضرات اور رویئے تبدیل کرنے والے عناصر و عوامل

خوبصورت چہروں، لمبے چمکدار بالوں، مقناطیسی مسکانوں کے مالک عورتیں اور مرد، جنہیں ہم روز مختلف اشتہاری فلموں میں ٹی وی سکرینوں اور بل بورڈوں پر دیکھتے ہیں، جنہیں نت نئے انداز میں، مختلف مصنوعات کی فروخت کے لئے اشتہاری کمپنیاں استعمال کرتی ہیں۔ ان کا حسن، طرحداری اور کشش ان کا ذاتی، فطری اور خداداد ہوتا ہے، یہ جس شیمپو، صابن، کریم اور کولڈ ڈرنک کی تعریف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے اکثر یہ خود استعمال نہیں کرتے۔ ان کے حسن کے پیچھے بیٹھا چالاک سیٹھ ان کے ذریعے لاکھوں، کروڑوں لوگوں کو ہپناٹائز کرکے، ان سے دیکھنے والوں کے دل و دماغ کو متاثر اور رویوں کو تبدیل کرکے اپنی مصنوعات بیچتا ہے۔ خریدار اور صارفین اپنی ضرورت اور مرضی کی بجائے اپنے پسندیدہ کے "پسندیدہ" اور اکثر غیر ضروری اشیاء خریدتے ہیں۔ لیکن یہ احساس نہیں ہوتا کہ خریداری کرتے ہوئے وہ ایک مستقل نیم خوابیدگی کی حالت کے شکار ہوتے ہیں۔ اس عمل تنویمی کے دوران ان کو اپنے ذہن، اپنی پسند، اپنی ضرورت اور اپنے اخراجات پر بالکل اختیار نہیں ہوتا، وہ اپنی پسند، اپنی ضرورت اور اپنے اخراجات کے بارے میں خود فیصلہ نہیں کرسکتا اور اتنے بے خبر اور لاچار ہوتے ہیں کہ ان کو اپنے تبدیل شدہ رویئے، عادت اور پسند ناپسند کا بھی ادراک نہیں ہوتا۔ یقین نہیں آتا تو سردیوں میں آئس کریم کھانے اور کولڈ

ڈرنک پینے میں آپکی کون سی ضرورت اور حاجت کی تسکین ہوتی ہے؟ یا بڑے سٹور سے خریداری کے بعد گھر آکر آپکو کیوں احساس ہوتا ہے کہ آپ نے غیر ضروری آشیاء پھر خرید لی ہیں؟

بناسپتی گھی کو مارکیٹ کرنے کے دوران اس کی اشتہارات میں موٹے موٹے بچے دکھائے جاتے تھے اور صارف کو یقین دلایا جاتا تھا کہ یہ گھی استعمال کرنے سے ان کے بچے بھی ایسے موٹے اور "صحت مند" ہو جائیں گے، لیکن آج کل وہی کمپنیاں صارفین کو بتا رہی ہیں کہ گھی صحت کے لئے خطرناک اور کھانے کا تیل بہترین ہے، جبکہ موٹاپا ہزار بیماریوں کا سبب اور بذات خود ایک بیماری ہے۔ صارفین کو بتایا جاتا ہے فلاں تیل استعمل کریں یہ دل کا معاملہ ہے جبکہ دراصل یہ دماغ کا معاملہ ہوتا ہے۔ یوٹیوب پر آپکو ایسے بلیک اینڈ وائٹ اشتہارات مل جائیں گے جہاں ایک ڈاکٹر بالکل اسی طرح ایک نرس کو اپنے پسندیدہ سگریٹ برانڈ کے بارے میں بتاتا ہے، جیسے آج کل "ڈاکٹروں کی پسندیدہ" صابن کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔

ٹی وی کو، پیٹنٹ کروانے والے ادارے کے پاس، ایک ایسے آلے کے طور پر رجسٹرڈ کیا گیا ہے جس سے نکلنے والی لہریں اور شعائیں انسانی ذہن کو متاثر کرتی ہیں۔ دنیا بھر میں انسانوں کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والا آلہ ٹی وی ہے اس لیے دوسرے ذرائع ابلاغ کے مقابلے میں ٹی وی کو انسانی ذہن، پسند، ضرورت، خواہش اور رویوں کو تبدیل کرنے کے لئے بھرپور انداز اور موثر طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔

ایک وقت میں ہمارے ہاں ایک ٹی وی چینل ہوا کرتا تھا، جس کے ذریعے پروپیگنڈا اور سرکاری نکتہ نظر ناظرین تک پہنچایا جاتا تھا، زیادہ ٹی وی چینلز آنے کے بعد سمجھا جاتا ہے کہ میڈیا کی آزادی اور ورائٹی کی وجہ سے ناظرین کو زیادہ چوائس اور مختلف نکتہ نظر میسر ہیں۔ لیکن ایسا نہیں، اب ایک ذریعہ کی بجائے مختلف ذرائع سے، ایک بات، سمجھائی جارہی ہے، جو پہلے سے زیادہ موثر اور کارآمد طریقہ ہے۔ میڈیائی آزادی اور ورائٹی دراصل مختلف ذرائع سے ایک ہی بات، بار بار سمجھانے کی بھرپور کوشش ہے۔ ورنہ آپ کشمیر، انڈیا، سعودی عرب،

امت مسلمہ یا چین کے بارے میں سارے چینلز پر کون سی ورائٹی دیکھتے ہیں؟ آپ افغانستان، انڈیا یا پختون تحفظ موومنٹ کے بارے میں کون سی مثبت خبر دیکھتے ہیں؟ آپ نے آج تک کوئی ایسا ٹی وی پروگروم دیکھا ہے جس میں ماہرین صارفین کے استعمال کی کسی ایسی چیز پر تنقید کر رہے ہوں جو ان کی صحت کے لئے خراب یا خطرناک ہو؟ جب تک سگریٹ کے اشتہارات میں، سگریٹ پینے والا بھاگتی ہوئی گائے کو گرانے، جہاز کے کرتب دکھانے اور جاسوسی کے محیر العقول کارنامے دکھانے والا بتایا جارہا تھا تو کیا ٹی وی کے کسی چینل پر سگریٹ نوشی کو خطرناک بتایا جارہا تھا؟ جب وہ دکھایا جارہا تھا تو ہم اس پر یقین کر رہے تھے اور اب جب یہ دکھایا جارہاہے کہ سگریٹ نوشی صحت کیلئے مضر ہے تو ہم اس پر یقین کرتے ہیں۔ ہمارے رویے ایک سیال مادے کی طرح ہیں جن کو موڈیفائر جس شکل میں چاہے تبدیل کرتے رہتے ہیں ورنہ سگریٹ کمپنیاں پہلے قومی اور بین الاقوامی کرکٹ ٹورنامنٹ منعقد کراتے تھے، عمران خان کے چھ نمبر شرٹ کی وجہ سے پلئیر نمبر سیکس کا سگریٹ برانڈ بکتا تھا اور آج عمران خان، کینسر کا سبب بننے والے سگریٹ نوشی کا نمائیندہ بننے کی بجائے کینسر کے علاج کا برانڈ ایمبیسڈر ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے پسندیدہ انٹر ٹینمنٹ پروگراموں کے درمیان، کبھی کبھی، اشتہارات دیکھتے ہیں۔ لیکن درحقیقت میں ہم اشتہارات کے درمیان، اپنے پسندیدہ انٹر ٹینمنٹ پروگرام دیکھتے ہیں۔اسی طرح جب ہم معلوماتی اور تجزیاتی خبریں اور مذاکرے دیکھتے ہیں تو حقیقت میں ہمارے ذہن، پسند، ضرورت، خواہش اور رویوں کو مسلسل پروپیگنڈے کی بمباری سے متاثر کرکے تبدیل کیا جارہا ہوتا ہے۔ یوں کبھی ڈاکٹروں کی پسندیدہ سگریٹ ہم ہسند کرتے ہیں اور کبھی صابن، جبکہ ڈاکٹروں کا دونوں سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا۔

جو اینکرز، پروگرامز، سیاسی پارٹی یا گروہ، سرکاری یا "قومی" بیانیے کا ساتھ نہیں دیتے اور اپنا الگ اور آزاد نکتہ نظر رکھنے اور پیش کرنے پر مصر ہوتے ہیں ان کو بدنام کیا جاتا ہے، مذاق اڑایا جاتا ہے، پریس اور میڈیا میں بلیک آوٹ کیا جاتا ہے، ان کے پروگرام بند

کر دیئے جاتے ہیں، اشتہارات نہیں دیے جاتے اور ایسے گروہوں اور سیاسی جماعتوں پر غیر قانونی اور غیر آئینی ہونے کے الزامات لگا کر عدالتوں کے ذریعے پابندیاں لگائی جاتی ہیں، انکو، غدار، وطن دشمن، دشمن کا ایجنٹ اور یار قرار دے کر جیلوں میں ڈالا جاتا ہے جن سے بعض صورتوں میں ان کی جان بھی خطرے میں ڈالی جاتی ہے، وجہ ان کا نکتہ نظر عوام اور متعلقہ حلقوں تک پہنچانے سے روکنا ہوتا ہے، تاکہ سرکاری نکتہ نظر موثر رہے اور سچ دکھائی دے، اور سرکار کو اپنے موڈیفائرز آسانی سے اور بلا رکاوٹ استعمال کرنے کے مواقع ملے۔

کراؤن (حکمران) اور چرچ (مذہبی پیشوا) کے درمیان بڑا تاریخی تعلق ہے۔ حکمران کو مذہبی پیشوا، عوام کے سامنے سچا، ایماندار، نیک، اور اللہ کا بھیجا ہوا، ثابت کرتا ہے، ہمارے ہاں جس کی صدائیں عیدین اور جمعے کی خطبوں میں آج بھی السلطان ضل اللہ فی الارض کی شکل میں سنائی دیتی ہیں۔ جدید میڈیا سے پہلے مذہبی پیشوا بادشاہ کو مقدس بنا کر پیش کرتا اور بادشاہ بدلے میں مذہبی پیشوا کو آسمانوں کا پسندیدہ بتاتا اور دونوں باہمی اتفاق سے مزے کرتے۔

آج بھی ایک طرف جدید ذرائع ابلاغ یعنی ٹی وی، پریس، تعلیمی کتب اور سوشل میڈیا کے اجرتی جتھے، پروپیگنڈہ کے زور پر انسانی ذہنوں کو تبدیل کرنے میں جتھے ہوتے ہیں تو دوسری طرف روایتی پسماندہ اور مذہبی معاشروں میں مسجد و منبر، جبہ و دستار، مخدومین اور مشائخ اپنی تاریخی کردار تندہی سے سرانجام دیتے ہیں۔ آخر الذکر کی چمتکار پچھلی الیکشن میں بڑا واضح دکھائی دیا ہے۔

انسانی ذہنوں کا مطالعہ، رویوں کی تبدیلی، اس کے محرکات، انسانی ذہنوں پر اثر انداز ہونے والا ماحول، ذرائع، اسباب اور عوامل، ماہرین نفسیات، سماجیات، مصنوعات بیچنے سیٹھوں، انٹیلیجنس ایجنسیوں اور سیاسی پارٹیوں کی دلچسپی کا مرکز رہتا ہے۔ چپل کے تلوے پر لکھا ہوا سامنے آنے والا اللہ کا نام، اخبار میں شائع ہونے والا کسی محترم ہستی کا توہین آمیز خاکہ، کسی مسلک کی مقدسات کے خلاف دیا گیا بیان، کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی لیول پر مانیٹر کرتا رہتا ہے۔ ان واقعات کے رد عمل میں ظاہر ہونے والا غصہ، تشدد، نفرت کا

اظہار، احتجاج اور اس کی کمی بیشی کا تجزیہ ہوتا رہتاہ۔

اپنے ملکوں اور علاقوں سے نکالے گئے مہاجرین اور آئی ڈی پیز کی قطاریں بنوا کر، کھانا پینا، جیب خرچ اور ضروریات زندگی کے لئے گھنٹوں کڑکتی دھوپ اور یخ بستہ موسم میں انتظار کرانا، ان کی شخصی تبدیلی، پسند ناپسند، کنٹرولڈ اور نامانوس ماحول، احساس لاچارگی اور بے بسی کی صورتحال، دراصل ان کے رویوں میں جوہری تبدیلیوں اور مطلوبہ ذہنی اصلاح، ترمیم اور تبدیلی کے مراحل ہوتے ہیں۔ یہی کچھ غائب کردہ شدت پسند اور دہشت گرد ذہنوں کے ساتھ ان مراکز میں کیا جاتا ہے جہاں پر ان کو برسوں اپنے گھر والوں سے دور رکھا جاتا ہے تاکہ وہ شدت پسندی چھوڑ کر دوبارہ نارمل گذارنے کے قابل ہوں۔

مائنڈ کنٹرول اور ہیومن بیہیوریئل تبدیلی، دوائیوں کے براہ راست استعمال کے علاوہ، سیاستدانوں، مشہور کھلاڑیوں، اداکاروں، تعلیمی اداروں اور مذہبی اساتذہ اور مذہبی پیشواؤں کے ذریعے حاصل کی جاتا ہے۔ ساری دنیا کو نمک میں آئیوڈین کھلانے اور ارتھ ڈے مناتے ہوئے ایک گھنٹہ بجلی بند کرنا بھی اسی قسم کا عمل ہے جس میں احساس وشعور پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی قوانین کی اثر پذیری کو بھی مانیٹر کیا جاتا ہے۔ مشرف دور میں گھڑیاں آگے پیچھے کر کے صرف یہ جانچ کرنی تھی کہ لال مسجد سانحے کے بعد قوم کا رویہ حکومتی احکامات ماننے کے لئے کس حد تک مثبت ہے۔

انسانی رویوں کو تبدیل کرنے والا سب سے بڑا اور موثر ملکی ادارہ تبلیغی جماعت ہے۔ میرے بچپن میں پختون معاشرہ باقی پاکستانی معاشروں کی طرح چند تنقیصات کے باوجود ایک نارمل معاشرہ تھا۔ مسجدیں تھیں، نمازی تھے لیکن داڑھیاں خال خال تھیں، پردے کا واجبی سا رواج تھا، گاؤں کے مشرق میں بہنے والے دریا اور مغرب میں بہنے والے نہر میں گاؤں بھر کی عورتیں بغیر کسی خاص پردے کے کپڑے دھویا کرتی تھیں، خدائی خدمت گار تحریک، جو کہ باچا خان نے پختونوں میں جذبہ خدمت اور سیاسی بیداری کے لئے شروع کی تھی، کے تاریخی لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوجاتا ہے کہ پختون عورتیں اس تحریک کے جلسے جلوسوں میں باقاعدہ حصہ لیتی تھیں۔ مردان کے نواحی قصبے گوجر گڑھی میں منعقدہ، خدائی

خدمت گار تحریک کے ایک احتجاجی جلسے کو تشدد کے ذریعے منتشر کرنے والے انگریز پولیس افسر کیپٹن مرفی کو جلسے میں پانی پلانے والی ایک عورت نے گھوڑے سے گرا کر پانی پلانے والے مٹکے سے ہلاک کیا تھا۔

آج سے اسّی نوے سال پہلے پختون عورتیں جلسوں میں شرکاء کو پانی پلایا کرتی تھیں اور اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ میدان عمل میں مصروف تھیں، آج کی طرح شٹل کاک برقع میں محبوس تھیں اور نہ اتنی مجبور تھیں کہ مردوں کے درمیان میدان میں لٹا کر کوڑے مارے جاتے ہیں اور کسی مرد کے آبرو پر بل نہیں پڑتا۔ مردوں کی موجودگی میں عورتوں کو کوڑے مارنے کے عمل کو بہت بڑی ذہنی تبدیلی کی صورت میں دیکھا جانا چاہیے۔ خوشی کے مواقع پر ناچنے گانے والی فنکاراوں کو بلانا عام تھا، سردیوں میں پنجاب سے مشہور پہلوان بلائے جاتے، محلے محلے اکھاڑے بنائے جاتے، شام کے وقت دریا کے کنارے ریت میں کشتی کے مقابلے ہوتے اور جیت کی خوشیوں کو ویلوں اور ڈھول کی تھاپ پر منایا جاتا۔ پختوں آج کی طرح ہر طرف لمبی داڑھیوں، چھوٹی شلواروں اور جوق درجوق بستر اٹھائے کسی نامعلوم منزل کے مسافر نہیں ہوا کرتے تھے۔ حجرے (ڈیرے) آباد تھے، جہاں پر ملکی اور علاقائی مسائل پر بحثیں ہوتیں تھیں۔ آزادی سے پہلے پختون معاشرے کو باچا خان نے ترقی پسندی کے جس راہ پر ڈالا تھا، آزادی کے بعد اسے رجعت پسند قوتوں کے ذریعے ضائع کرا گیا۔

ہمسایہ معاشرے روایتی دھوتی سے پینٹ سوٹ میں تبدیل ہوئے جبکہ پختون معاشرے میں عقل دشمنی اور دنیا بیزاری کے بدروح پھڑ پھڑانے لگیں۔ ایک طرف بندوق برداروں نے پختونوں کے روایتی جرگے حجرے ملک اور سیاسی لیڈر شپ کو بارود کے دھوئیں میں تحلیل کر دیا ہے تو دوسری طرف مبلغین کے غولوں نے ان کی بدترین حالات کو ان کے اعمال کا نتیجہ باور کرا کر ان کو غیر سیاسی اور دنیا بیزار بنا دیا ہے۔ ایک حضرت سیاسی سرگرمیوں کو عین عبادت کہہ کر ان کو "باطل" سے ٹکرانے اور شہادت کے حصول کی شہہ دے رہا ہے اور دوسرے حضرت، جن کو گزشتہ عشرے میں بڑے کمال کے ساتھ گروم کر کے میدان میں اتارا گیا تھا، اپنے انہی پیروکاروں کو اللہ کے واسطے دے کر سیاست سے

کنارہ کشی کی ترغیب دیتے ہیں۔ ٹی وی بذات خود انسانی رویوں کو تبدیل کرنے کا موثر آلہ ہوتا ہے، جب اسی ٹی وی پر کوئی مذہبی پیشوا انسانی رویوں کو تبدیل کرنے کی سعی کرتا ہے تو اثر دو چند ہو جاتا ہے۔

حاضرات جیتتے ہیں یا حضرات، یہ فیصلہ چند دنوں میں ہو جائے گا، لیکن تبدیلی سرکار نے ایک حضرت (مولانا فضل الرحمان) کے ملیئن مارچ کا علاج دوسرے حضرت (طارق جمیل) کے دسیوں ملیئنوں پیروکاروں کے ذریعے کر کے نہ صرف یہ کہ مستقبل میں ٹارگٹڈ ایریا میں جوہری ذہنی تبدیلیوں کی نشاندھی کی ہے بلکہ طاقت کا مرکز بھی علاقے سے پنجاب شفٹ کرنے کی دھمکی دی ہے۔ اگرچہ محبوس ماحول میں رواں مذاکرات اور اسلام آباد کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی چھاپ آپس میں بظاہر کوئی میل نہیں کھاتی لیکن پختونخوا اور پنجاب کے منتظمین اس قسم کی صورت حال میں کچھ نہ کرنے کے لئے چنے گئے تھے۔ کیونکہ اسلام آباد کے لئے جانے والے دونوں راستے انہی نو وارد اور احسان مند منتظمین کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ ایک حضرت کو دوسرے حضرت کے ذریعے اپنے حد میں رہنے اور طے شدہ ضوابط کے مطابق کھیلنے کا یلو کارڈ دکھایا گیا ہے۔ حضرات اور حاضرات دونوں آخری آخری تیاریوں میں مصروف ہیں نیازی سے بے نیاز ہو کر۔

جہاد کشمیر کے ثمرات، پختون اور جناح صاحب کا ٹیلکس

ہندوستان تقسیم کیا گیا تو نیا اسلامی ملک 1935 کے انگریز کے بنائے ہوئے قانون کے تحت چلانا منظور ہوا۔ وزیر خارجہ قادیانی، وزیر قانون ہندو، اور جرنیل کرنیل انگریز بنے۔ فارورڈ پالیسی والوں نے گریٹ گیم کے تحت جیسی فیلڈنگ ترتیب دی تھی، اسی فیلڈنگ کے ساتھ دوسری اننگ شروع کی تو میدانی علاقوں کے پختونوں پر سیاسی مفتی و ملا، سرکاری اور انگریز دوست پیر اور دوسرے صوبوں سے لائے گئے موقع پرست سیاستدان مسلط کیے گئے اور پہاڑی علاقوں کے پختونوں (قبائل) الگ رکھ کر اولف کیرو اور اس قبیل کے دوسرے برطانوی منصوبہ سازوں کے حوالے کیے گئے، جن میں غالب اکثریت مطلق ان پڑھ، حماقت کی حد تک بہادر، اس صلاحیت پر فخر کرنے والوں اور اس کو ثابت کرنے والوں پر مشتمل تھی۔ میجر خورشید، میجر جنرل اکبر خان اور ہمنواوں نے انگریز سول اور فوجی افسروں کی ایما پر بندوق سے پیار کرنے والے ان سادہ دل پختونوں کو اپنے علاقوں سے دور، کشمیر میں "جہاد" کے لیے بھیجا، جہاں پر آج ان کی نسل چھلیاں بیچتی ہیں جوتے پالش کرتی ہے اور کشمیریوں کے بدترین تعصب کی شکار ہے۔

پختونوں کو کشمیر میں داخل کرنے سے دل چسپی رکھنے والی مختلف پارٹیوں نے، مختلف

اور دیرپا مفادات حاصل کیے، انگریزوں نے برصغیر کو تقسیم تو کیا تھا لیکن تقسیم کی وجہ سے درمیان میں موجود اور پیدا ہونے والے تنازعات کی حل کے لئے کوئی قابل قبول اور قابل عمل میکینزم نہیں تھا تا کہ انگریز کو مسائل بنانے اور حل کرنے میں بالا دستی حاصل رہے، پھر بھی تصفیے کی کوئی صورت ہو سکتی تھی تو اس کا امکان جناح صاحب نے آخری وقت پر خود کو گورنر جنرل نامزد کر کے ہمیشہ کے لیے ختم کر دی۔

یہ تقسیم ویسے بھی تضادات اور تنازعات کی شروعات تھی خاتمہ نہیں، کیوں کہ آدھی سے کچھ کم مسلمان آبادی کو، جس میں آدھی نے پاکستان جانا ہی نہیں تھا، ہندوستان کے دونوں کناروں پر، ایک دوسرے سے دور، زمین کے چھوٹے چھوٹے دو ٹکڑے دیے جو ثقافتی، اقتصادی، فکری، تاریخی اور لسانی طور پر ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے، یوں پاکستان کے اندرونی اور مستقبل کے معاملات، دفاعی، انتظامی اور خارجہ امور پر ملک میں موجود انگریز افسر مکمل طور پر حاوی ہو گئے۔

این ڈبلیو ایف پی یعنی پختون خوا میں موجود انگریزوں کی ایما پر، کشمیری اور لوکل سرکاری اور غیر سرکاری افراد نے قبائلیوں کو بندوق، جیب خرچ اور ٹرانسپورٹ مہیا کی، یوں کشمیر جہاد شروع ہوا، جس کی پہلی گولی چلانے کے دعوے آج تک مختلف اقوام کے بہادر لیڈر اور رہنما کرتے آرہے ہیں۔ اس کے بعد جو ہوا سب جانتے ہیں، لیکن چارسدہ کے میجر جنرل اکبر خان کی کتاب The raiders کے علاوہ ان سادہ دل اور بے وقوف پختونوں کا ذکر تاریخ کی کسی پاکستانی کتاب میں موجود نہیں جبکہ کشمیری آج بھی ان کو ڈاکوؤں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اس "جہاد" سے انگریزوں نے ایک نئے، چھوٹے اور کم زور ملک کو ایک بڑے، پرانے اور مضبوط ملک کے ساتھ مستقل بنیادوں پر دشمنی میں جوت دیا، جس کی وجہ سے انگریز نے اس نئے ملک کو دشمن کا خوف دلا کر ہمیشہ اپنی مالی مدد، اسلحے اور سفارتی حمایت کا باج گزار بنایا، اسے قرضے دیے، اس کی فوج کو ٹریننگ دی، نیز آبادی کی مناسبت سے زیادہ فوج رکھنے کے راستے پر ڈال کر اس کو مستقل معاشی، فکری اور سیاسی بحران میں گرفتار کیا،

آگے سیٹو، سینٹو، نان نیٹو اتحادی، افغان وار، طالبان، دہشت گردی، ایوب خان، یحییٰ خان، ضیاء الحق، مشرف، راحیل شریف، قمر باجوہ، فیض حمید اور ایٹم بم کے تحفے دیے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کی دریوزہ گری سکھائی اور دو مخالف پارٹیوں یعنی سیاسی یا سویلین اور فوجی یا مارشلائی قطبین تخلیق کیے گیے جو ملکی بگ بینگ کے دن سے لے کر آج تک مسلسل ایک دوسرے سے فاصلے بڑھاتے رہے ہیں۔ نتیجتاً قوم بارود کی بنی، بارود کھاتی، بارود سونگھتی اور بارود سوچتی ہے۔ کرہ ارض کی سب سے بڑی جنگ، جس میں ہر قوم اور ملک شامل تھا، ہمارے ہاں لڑی گئی، جس سے مغرب کو آزادی ملی، جرمنی کو اتحاد ملا اور امریکا کو بلا شرکت غیرے پوری دنیا، لیکن جادو یہ ہوئی کہ اس عالمی جنگ میں مغربی ممالک پر کوئی حملہ ہوا نہ کوئی یورپی چینی جاپانی برطانوی یا امریکی مرا۔ پختونوں نے دوسروں کی دنیا تبدیل کردی اپنا گھر جلا ڈالا۔

اس "جہاد" کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ تقسیم سے پہلے اس وقت کی سرحد اور آج کے پختونخوا میں خدائی خدمت گار تحریک اور کانگریس کی مشترکہ حکومت تھی، ہندوؤں اور مسلمانوں (پختونوں) کے درمیان مثالی، پرامن اور دوستانہ تعلقات تھے، گاندھی چارسدہ آتے تھے اور باچاخان کو ہندو گاندھی جتنی عزت دیتے تھے، پختونوں کو کشمیر میں گھسا کر کانگریس اور خدائی خدمت گار تحریک، پختون قوم پرست اور ہندوستانی عوام، عبدالغفار خان اور کانگریس لیڈرشپ کے درمیان باہمی خیر خواہی پر مبنی تعلقات کو خراب کیا، نیز فقیر اپی اور باچاخان کے پیروکاوں کو شیر و شکر ہونے اور متحد ہونے کی بجائے ایک دوسرے سے دور، مخالفت اور مخاصمت کے راستوں پر ڈالا گیا، جس کا بدترین مظاہرہ، فقیر اپی کے علاقے کے باشندوں کے، باچاخان کے پیروکاروں کے علاقے پر مسلسل حملوں، بم دھاکوں، تعلیمی اداروں کی تباہی، سیاسی رہنماؤں اور ورکروں کی بے رحمانہ قتال کی صورت میں کیا گیا۔

چودھری محمد علی، پاکستان کے مشہور بیوروکریٹ، مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل اور پاکستان کے چوتھے وزیر اعظم نے، اپنی کتاب the emergence of Pakistan میں ایک ٹیلکس کی کاپی لگا کر لکھا ہے کہ یہ ٹیلکس پاکستان کے گورنر جنرل اور بابائے قوم نے

ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پختون حملہ آوروں کے کشمیر میں گھسنے کے بعد بھیجا تھا، جس میں لکھا ہے کہ کشمیر پر حملہ پاکستانی فوج نے نہیں بلکہ پختون قبائل نے کیا ہے۔ بھارت کو چاہیئے کہ ان حملہ آوروں کو کشمیر سے نکل جانے کی الٹی میٹم دیدے اگر مجوزہ دنوں میں یہ لوگ کشمیر سے نہ نکلے، تو بھارت اپنی طرف سے اور پاکستان اپنی طرف سے حملہ کر کے انکو زبردستی کشمیر سے نکال دیں گے۔ چودھری محمد علی اگے لکھتے ہیں کہ بھارت جناح صاحب کی تجویز ماننے کی بجائے سلامتی کونسل چلا گیا۔

اگر بھارت جناح صاحب کی تجویز مان لیتا، تو قبائلی سورمے ستر سال پہلے اپنے انجام کو پہنچ چکے ہوتے لیکن انگریزوں کو روس کے خلاف مستقبل میں ان کی ضرورت تھی، اس لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی دور اندیشی نے ان کو بچالیا۔ دراصل پاکستانی اور بھارتی افواج کی کمان دونوں طرف سے برطانوی فوجی افسروں کے ہاتھوں میں تھی اور وہ کشمیر کا مسئلہ پیدا کر کے پاکستان کو قابو، روس کو تباہ اور ہندوستان کو مستقبل میں زیر احسان رکھنا چاہتے تھے۔ جب کہ پاکستان کے ساتھ مل کر، پختونوں کے خلاف فوج کشی نہ کر کے وہ ان کو مستقبل کے لیے سنبھال کر رکھنا چاہتے تھے۔ جبکہ اس وقت کی مسلم لیگیاور پاکستانی سیاسی قیادت پختونوں کو قربانی کے بکرے کے طور پر استعمال کرنا چاہتی تھی تا کہ بھارت کے ساتھ مسائل کے حل کے لیے کوئی قابل عمل میکینزم بن سکے، جس کے تحت دونوں آپس میں بیٹھ کر اپنے مسائل حل کر سکیں۔

حیرانی اس وقت ہوتی ہے کہ جب پاکستانی حکومت انگریزی رضامندی سے پختون قبائل کو کشمیر میں بھیج رہی تھی تو وہ اپنے آپ کو کیسے مطمئن کرتی کہ یہاں کے انگریز وہاں کے انگریزوں کو اس ساری صورت احوال سے پیشگی آگاہ نہیں کریں گے اور ان کا راز راز رہے گا؟ رہی بات کشمیر میں فوج کشی، جنرل گریسی اور جناح صاحب کی تو وہ افسانہ کسی اور دن، کیا آپ مانتے ہیں کہ دونوں طرف کے برطانوی فوجی افسران ترک کرنے والے ہندوستان کیلئے آپس میں لڑتے؟

مہاراجہ رنجیت سنگھ اور پختون پنجابی تعلقات

مہاراجہ رنجیت سنگھ پنجابی شاونسٹ قوم پرستوں کی بالادستی کا علامتی اسطورہ ہے۔ چونکہ تاریخی طور پر مسلمان پنجابی نامعلوم وقت سے مزاحمتی اسطوروں، سیاسی اور جنگی قیادت اور اسی قسم کی علامتوں کی لحاظ سے بانجھ پن کا شکار ہے اس لیے مذہبی طور پر الگ سہی، لیکن نسلی طور پر پنجابی قوم پرست مسلمان اور سکھ دونوں کے لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے بڑھ کر کوئی مشترکہ ہیرو نہیں، پھر دونوں یعنی مسلمان پنجابی اور سکھ پنجابی کا تاریخی مقابل اور مخالف بھی مشترکہ طور پر ایک ہی یعنی پختون ہے۔ سکھ پنجابی نے ماضی قریب میں پشاور تک حکومت کرکے پختونوں کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے بعد اپنے دلی ارمان بڑی حد تک پورے کر لیے ہیں، لیکن مسلمان پنجابی کو، باوجود سکھ حکمرانوں کے ساجھے دار ہونے کے ابھی تک کوئی ایسا کھلا موقع نہیں ملا جس میں وہ صدیوں پر محیط اپنی ذاتی، مذہبی اور نسلی توہین کا حساب کتاب چکا سکے۔

ماضی میں پختون کبھی خود افغانستان کے کوہ ودمن سے ہندوستان کو باجگزار بنانے کی نیت سے اترا تو کبھی کسی اور حملہ آور کے ہراول دستے میں شامل تھا۔ اس نے ہندوستان جانے کے لئے لازماً راستے میں پڑنے والے پنجاب کے دیہات کو لوٹا، محنت سے اگائی گئی ان کی قیمتی فصلوں کو اپنے گھوڑوں کے لئے چارے کے طور پر استعمال کیا، ایسے مویشیوں کو جو ان کے مذہب میں مقدس تھے، کاٹ کر پیٹ کی دوزخ بجھائی، ان کے مال منال پر ہاتھ صاف کیے،

ان کے مندروں، مقدس مذہبی علامات، شخصیات اور مورتیوں کی توہین کی انسانی جانوں اور عزتوں کے ساتھ کھلواڑ کیا، تبھی تو آج تک پنجابی مائیں اپنے بچوں کو پٹھان کے چک (اٹھا) کر لے جانے کی تنبیہہ کرتی سنائی دیتی ہیں۔ پنجابی ماؤں کی اس ایک تنبیہہ میں بے بسی، نفرت اور ظلم کی پوری تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ باوجود اسکے، کہ آج مختلف وجوہ کی بنا پر بلوچ پنجابیوں کو مار رہے ہیں لیکن کسی پنجابی اسطورہ یا رویے میں بلوچ کے لئے نفرت کا کوئی اظہار یہ نہیں ملتا، وجہ یہ ہے کہ یہ حالیہ واقعات اور واردات ہیں، ابھی پنجابی فطرت اور رویوں کے سانچوں میں نہیں ڈھلے، پھر یہ واردات پنجابی سرزمین اور آنکھوں سے دور بلوچستان میں وقوع پذیر ہو رہے ہیں، اس لیے اتنے موثر نہیں کہ پنجابی نفسیات پر اسی طرح چرکے لگا سکے جس طرح پختون حملہ آوروں نے لگوایے ہیں۔

پنجابیوں میں میرے بہت اچھے دوست موجود ہیں جو پختونوں سے بڑھکر دوستی نبھانے والے ہیں، لیکن تاریخی تناظر میں قومی سطح پر پنجابی اور پختون نہ کبھی دوست رہے اور نہ ماضی قریب میں ایسا ہونا ممکن ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دونوں اقوام کے درمیان صدیوں کی نفرتوں کا ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر موجود ہے اور یہ نفرتیں بھی یک طرفہ پنجاب کے اندر موجود ہیں، زیادتی ہمیشہ متاثرہ فریق کو یاد رہتی ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی چند سالہ حکومت کے علاوہ حملہ آور ہمیشہ پختون سرزمین سے پنجابی سرزمین پر وارد ہوئے تھے اس لیے ان حملوں کے دوران لگائے گئے نفسیاتی چرکے صرف پنجابی رویوں سے رستے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت سکھوں کی مذہبی حکومت نہیں، مسلمان اور سکھ دونوں پنجابیوں کی مشترکہ حکومت تھی، جس میں مسلمان پنجابی سکھ پنجابی کا برابر کا ساجھے دار تھا اور چونکہ دونوں ماضی میں پختونوں کے ہاتھوں نفسیاتی زخموں سے چور چور تھے اس لیے دونوں نے ملکر اپنے حملوں کا رخ کسی اور ہمسایہ یعنی بلوچ اور سندھی کی بجائے پختون کی طرف کر دیا تاکہ صدیوں پر مشتمل ذاتی، نسلی اور مذہبی توہین، لوٹ مار اور شکستوں کے بدلے میں جمع شدہ غصے کا اظہار کیا جا سکے۔

مذہبی منافرت، بدترین اور اندھی منافرت ہوتی ہے، جس کے وحشیانہ مظاہرے تقسیم ہند کے وقت، پنجابی سکھوں اور پنجابی مسلمانوں نے ایک دوسرے کی جان لینے، جائیدادیں اور عزتیں لوٹنے کے دوران پاگل بن کر کی جو حال میں پختون طالبان نے قوم پرست پختونوں کے خلاف کی۔ تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے بندہ، انگریزی جادوگری کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتا ہے کہ کچھ عشروں پہلے جو سکھ اور مسلمان پنجابی یک جان ہو کر پختونوں کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے چند عشروں بعد وہی پنجابی سکھ اور پنجابی مسلمان ایک دوسرے کی جان ومال اور عزتیں لوٹنے میں مصروف تھے۔

آپریشن بلیو سٹار، اندرا گاندھی کے قتل کے بعد سکھوں کی قتل عام، پاکستان آنے والے سکھ زائرین کے ساتھ پنجابی مسلمانوں کا برادرانہ سلوک، پاکستانی نصابی کتب میں، سکھ مسلم فسادات کو ہندو مسلم فسادات کا نام دینا، کرتارپورہ کی کھلی سرحد، سدھو کی جپھی، اور اب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مفتوحہ پشاور کے بالاحصار قلعے میں تصویر کی تنصیب، پنجابیوں کی قوم پرستی کی طرف جاری سفر معکوس میں آنے والے سنگ میل ہیں جو حالات وواقعات کی پیش بندی کی نشاندھی کے ساتھ ساتھ مستقبل میں بہت ساری سیاسی اور نظریاتی تبدیلیوں کی نقیب ہو سکتی ہیں۔

خوف کی صنعت

اگر اسلحہ سازی صنعت ہے تو جنگیں اس اسلحے کی جانچ، مظاہرہ اور مارکیٹنگ کے لئے وقفے وقفے سے منعقد ہونے والے عالمی ٹورنامنٹس ہیں، جو کمزور اور نسبتاً پسماندہ ممالک کے محاذوں، میدانوں اور شہروں میں منعقد کیے جاتے ہیں۔ جنگوں کی اصطلاحاتی درجہ بندی میں، ففتھ جنریشن وارفیئر آج کل ہمارے ہاں زیر بحث ہے جو میدانوں اور محاذوں سے زیادہ ذہنوں میں لڑی جانے والی جنگ ہے۔ ایک زمانے میں مشہور ترین اصطلاح، جو اخبارات اور خبروں کا عام موضوع ہوتا تھا، کولڈ وار کہلایا جاتا تھا، جس کو عموماً نظریاتی پروپیگنڈے اور مذہبی صف بندیوں کے ذریعے گرم رکھا جاتا تھا۔ کمیونزم جس کا سرخیل روس تھا، گاڈلیس، لادین اور دہریہ مشہور تھا، جبکہ سرمایہ دار ایک خدا یعنی منافع کے ماننے والے تھے، چونکہ کمیونسٹ، سامری کے اس سنہرے بچھڑے یعنی منافع کے منکر تھے اس لیے لادین کہلاتے تھے۔ لیکن کولڈ وار کے دوران سب سے زیادہ دلچسپ کردار اکثر اور اہم مسلم ممالک کا تھا۔ اسلام جو اپنی تعلیمات کی رو سے، مظلوم، مقہور اور پسے ہوئے طبقات کی عزت کے ساتھ جینے کے حق کا داعی تھا، سنہرے بچھڑے کے پجاریوں یعنی سرمایہ داری کی صف میں، منافع خوروں کے ساتھ، کاندھے سے کاندھا اور ٹخنے سے ٹخنہ ملا کر اور پائنچے اٹھا کر کھڑا نظر آیا۔

اس دور میں بھی جنگیں آج کی طرح تیسری دنیا کے ممالک ویتنام، کوریا کمپوچیا وغیرہ میں لڑی جاتی تھیں، جس میں کسی نے اپنا اسلحہ بیچا اور کسی نے جانچا۔ جب روس ٹائٹینک

کی طرح اپنی بوجھ کے نیچے ٹوٹ کر ڈوبا تو معلوم ہوا کہ اللہ کے منکر اور دہریئے روس کی سرزمین پر انسانیت کی تذلیل اور استحصال کا سب سے پرانا اور بدترین ادارہ، چکلہ ایک بھی نہیں تھا، جبکہ منافع کی توقع ہو تو سرمایہ دار اپنے ضمیر سمیت سب کچھ مارکیٹ کرنے کو تیار ہوتا ہے۔

کولڈ وار کے خاتمے پر پرانی صف بندیاں ٹوٹ گئیں تو ہینگٹنٹن کے ذریعے تہذیبوں کی تصادم کے ٹورنامنٹ کے لئے ٹیمیں تیار ہونے لگیں۔ کیونکہ ٹورنامنٹس منعقد نہیں ہوں گی تو اسلحہ سازی کی صنعت کیا شب برات میں کام آئے گی؟

انسانی نفسیات کو سب سے زیادہ انگیخت کرنے والی محرکات لالچ اور خوف ہیں (**اطعمهم من جوعهم و امنهم من خوف**)، اس لیے سرمایہ داری کو کمیونزم کے کھلانے، پہنانے اور سر چھپانے یعنی منافع کمانے کے مواقع کے منشور کا خوف تھا اور کمیونزم اپنانے والوں کو کھانے، پہننے اور سر چھپانے کا لالچ۔ کمیونزم کو اپنی ساحرانہ مہارتوں سے پچھاڑنے کے بعد سرمایہ داری کو کوئی خوف نہ رہا تو اسلحے کی صنعت کیلئے، جو کمیونسٹ دشمن کی شکست کے بعد تقریباً بند ہونے لگی تھی، نیا دشمن ڈھونڈھنا ضروری ہو گیا تھا۔ مسلمان جن کی اکثریت کولڈ وار کے دوران سرمایہ داروں کے ساجھے دار اور اہل کتاب بھائی تھے، تیل اور معدنیات کی دولت سے مالامال ہونے کے باوجود ابھی تک منافع خوروں سے کمیونزم کی موجودگی کی وجہ سے بچے ہوئے تھے، لیکن تابکے۔

طاقتور اقوام جنگیں، خوف اور جھوٹ کے زور پر لڑتی ہیں، جبکہ ان کی جارحیت کی شکار قومیں، عزم، قومی یک جہتی اور انسانیت کے ہتھیاروں سے ان کا مقابلہ کرتی ہیں، لیکن جنگوں میں اکثر و بیشتر ہار انسانیت ہوتی ہے۔ کمیونزم کا منافع دشمن نظریہ سامنے نہ رہا تو سرمایہ داری کے انسان دشمن حربی صنعت کو زندہ رکھنے کے لئے جنگی حکمت عملی کے ماہرین، اسلحہ بیچنے کے صنعتکاروں، کمیشن کھانے والے سوداگر اور دلالوں، انسانی نفسیات کو مینیپولیٹ کرنے والے استادوں اور میڈیا ہاؤسز کے مالکان نے ایک نیا دشمن دہشت گرد کے نام سے تراشا اور دنیا پر مسلط کر دیا۔ چہروں کو صافوں میں چھپائے طالبان کے نام سے قاتلوں کی ایک

تجرباتی نرسری لگائی گئی جنہوں نے خوف کی اس نئی صنعت کے لئے ماحول اور مارکیٹ پیدا کی، آگے انہی طالبانی تجربات کو بہتر کرکے داعش کے نام سے جدید عفریت ایجاد کرکے شہروں اور دیہات پر چھوڑ دی گئی۔

افغانستان کے بجلی کے کچے بغیر گاؤوں اور قدیم معاشرے میں رہائش پذیر، برخود غلط نظریاتی باغیوں اور انقلابیوں کے ایک گروہ نے، جن کے درمیان سارے اہم جاسوسی اداروں کے ڈبل ایجنٹ ہمہ وقت موجود ہوتے تھے، جن کی برقی پیغام رسانی، ذاتی اور سامان کی آمد و رفت کی ہمہ وقت، سمندری اور ہوائی اڈوں پر خصوصی نگرانی کی جاتی تھی، ایک معجزہ کر دکھایا۔ امریکہ اور جرمنی سے کچھ نیم ان پڑھ، دیہاتیوں (بدووں) نے جہاز اڑانے کی تربیت لی، (9 / 11 کی کیمشن کے رپورٹ کے مطابق یہ "پائلٹ" صرف ہوا میں جہاز کنٹرول کر سکتے تھے، جہاز کی ٹیک آف اور اتارنے میں اناڑی تھے) جنہوں نے امیگریشن اور ائیرپورٹ سیکیورٹی کے ساتھ ساتھ سارے امریکی جاسوسی اداروں کو باوجود تنبیہات اور وارننگز کے چکمہ دیا (ائیرپورٹ سیکیورٹی اور کیلئرنس پر مامور کسی امریکی اہلکار کو اتنی تباہ کن اور مجرمانہ "غفلت" پر آج تک کوئی سزا نہیں ملی)، شہر کے درمیان، سب سے اہم بلڈنگ سے دس منٹ کے وقفے سے دو جہاز ٹکرائے، جن کی پہلے سے لگے ہوئے کیمروں کے ذریعے مختلف زاویوں سے باقاعدہ فلم بندی کی جاتی رہی (یہ پہلی جنگ تھی جس کی افتتاح سے لے کر اخر تک بڑا حصہ ناظرین کے لئے براہ راست یا بالواسطہ نشر کیا گیا، کیونکہ ان کو خوفزدہ کرنا مقصود تھا)۔ اس نئی جنگ کی بنیادی تھیم خوف تھی، اس لیے خوف پھیلا کر اس خوف کے خلاف تحفظ کا احساس دلانے والی نئی جنگی ایجادات اور اس سے منسلک مختلف اشیاء دنیا کو بیچنی تھی، اس لئے مارکیٹنگ کی غرض سے ان گیجٹس کو بیچنے کے لئے مناسب ماحول اور مواقع پیدا کر کے خوف کی صنعت کا افتتاح کیا گیا۔

خوف کی صنعت نے خفیہ (وہ اشیاء جو مختلف ممالک کے جاسوسی اداروں کو بیچی گئیں) اور علانیہ طور پر کھربوں روپے کی مصنوعات دنیا میں بیچی گئیں جو، اگر خوف کا بنایا گیا موجودہ ماحول نہ ہوتا خریدنا تو درکنار کوئی دیکھنے کا بھی روادار نہ ہوتا۔ ہر ملک میں، گلیوں،

چوراہوں، اہم سرکاری اور غیر سرکاری عمارات، گھروں، تعلیمی اداروں، ہسپتالوں، بنکوں، ریستورانوں، ہاسٹلوں، غرض یہ کہ ہر پول، دیوار اور درخت پر کیمرے لگائے گئے، کمپیوٹر سسٹم اور ڈی وی آر خریدے گئے، واک تھرو گیٹ اور ایکسرے مشین لگائی گئیں، سامان، کنٹینرز، گاڑیوں اور انسانی جانچ کی غرض سے سیکنرز نصب کئے گئے، بموں کو ڈھونڈنے، ناکارہ کرنے یا محفوظ بنانے کے بعد اڑانے کے لئے روبوٹ اور پریشر گن خریدی گئیں، خودکش گاڑیوں اور خودکش دیوانوں کو حملہ کرنے سے پہلے معلوم کرنے والے تربیت یافتہ کتے مہیا کیے گئے، جیمرز اور بلٹ پروف اور بم پروف گاڑیوں سمیت بلٹ پروف جیکٹیں بیچی گئیں، مسلسل نگرانی اور حملہ کرنے کی صلاحیت سے لیس معجزہ نما جنگی کھلونے، ڈرون مارکیٹ کیے گئے، جن کی حربی صلاحیتوں کو خریداروں کو دکھانے کی غرض سے، رئیل ٹائم میں ریکارڈ شدہ اور بعض اوقات لائیو سٹریمنگ کرتی ہلاکت خیز فلمیں دکھائی گئیں، جس میں اکثر ایک "دہشتگرد" کو مارنے کے لئے چلائے گئے میزائل، موقع پر موجود بیشمار معصوم لوگوں کے پرخچے اڑاتے نظر آتے، جس کو منافع خور کولیٹرل ڈیمیجز کا بے جان نام دیتے، جسے ہر کسی نے بڑے سکون کے ساتھ اپنے اپنے ڈرائنگ رومز میں ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر دیکھا۔ چونکہ خوف کی صنعت کو گھر گھر پہنچانا مقصود تھا اس لئے نفسیات ماہرین کے ذریعے نہ صرف کامیابی سے ان مصنوعات گھر گھر پنچایا گیا بلکہ اچھے خاصے، جنگ مخالف اور انسانیت دوست شہریوں کے لئے اس قتل عام کو قابلِ قبول بنایا گیا۔ خوف کی صنعت کی اس جارحانہ اور بدترین مارکیٹنگ سے زیادہ اور موثر مارکیٹنگ سٹریٹیجی ابھی مصنوعات بنانے والے کسی ادارے کے پبلسٹی ماہرین نے سوچنی ہے۔

جہاز اڑانے والے خودکش دہشتگرد ایک چوتھائی سعودی، بقایا مصری اور ایک ادھ گلف سٹیٹ سے تھے اور یہ سارے ممالک امریکن اتحادی ہیں لیکن نزلہ عراق پر گرا، اور وہ اس لئے کہ وہ خوف کی صنعت کا خریدار نہیں ہو سکتا تھا بلکہ ولن بنانا مقصود تھا۔ اس جنگ میں افغانستان کو ڈیزی کٹر اور مدر اف بمز کے تجربات کے لیے چنا گیا اور افغانستان سمیت پاکستان کے قبائلی علاقوں کو ڈرونز کی مختلف صلاحیتوں کے مظاہرے یعنی نگرانی، حملے، حملوں کی جانچ

اور اس کی مارکیٹنگ کے لئے نمائشی میدان کے طور پر استعمال کیا گیا۔

سرمایہ داری کے خدا یعنی منافع کے سینے میں دل نہیں لالچ ہوتا ہے، اس لیے، خوف کی صنعت کے خلاف بڑے بڑے جلوس نکالنے والے یورپئین ممالک کے بڑے مرکزی شہروں یعنی انگلینڈ، میڈرڈ، پیرس، برسلز، نیس اور برلن میں، بعد میں، دہشتگردانہ کارروائیاں کرا کر نہ صرف جنگ مخالف لوگوں کو جنگ کے حق میں کر دیا گیا بلکہ ان کی حکومتوں نے حفاظتی گیجٹس کی خریداری پر بھی خطیر رقمیں خرچ کر دی جس کی ایک مثال برطانیہ ہے جہاں انگلینڈ حملے میں صرف پانچ شہری مارے گئے لیکن تھریسا مے کی حکومت نے فوری طور پر 2.5 بلیئن پاؤنڈ کی رقم اس جنگ پر خرچ کرنے کے لئے مختص کرنے کے ساتھ اٹھارہ ہزار افراد کو جاسوسی اداروں میں بھرتی کرنے کا حکم دیا۔

سکینڈے نیویا یعنی سویڈن، ڈنمارک، ناروے وغیرہ ہماری دنیا میں ایک الگ دنیا ہے، جو باقی دنیا کی سیاست اور سیادت سے زیادہ سروکار نہیں رکھتی لیکن وہاں پر خوف کی صنعت کاروں کی ایماء پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ناشائستہ خاکے ایک لوکل اخبار میں چھپوائے گئے، جس کی وجہ سے وہ بھی مسلمانوں کے غیظ وغضب کا نشانہ بنے، جس کی خوف سے خوف کی صنعتکاروں نے ان کو بھی اپنا سامان بیچا۔ مشرق بعید کے مثالی برداشت والے تکثیر پسند معاشروں کو خوفزدہ کرنے کی خاطر سیر وسیاحت کے روزگار سے منسلک علاقے بالی میں دھماکے کروا کر خوف کے صنعت کاروں نے وہاں بھی اپنی تجارت کی۔

نیوزی لینڈ کا حالیہ خونریز واقعہ خوف کی صنعت کی زوال پذیر مارکیٹ کو نئی زندگی اور نئے گاہک بنانے کی ایک اور کوشش تھی اس لئے کہ نیوزی لینڈ بھی سکینڈے نیوین ممالک کی طرح دنیا سے الگ تھلگ خطہ ہے، جس کو وہاں کی وزیر اعظم نے اپنی حکمت عملی سے ناکام بنایا لیکن آسٹریلیا کی مارکیٹ ابھی کھلی ہے۔

سرمایہ داری نظام منافع کو بلاشرکت غیرے ہڑپ کرنا چاہتا ہے اس لیے کسی قسم کی مسابقت یا مقابلہ بالکل برداشت نہیں کرتا، اس لئے اپنے پرائیویٹ ملیشیا کو ملٹری کنٹریکٹرز، زی سیکورٹی کمپنی اور بلیک واٹر کے فینسی ناموں سے پکارتا ہے اور ان کی خدمات یعنی مخالفین

کی قتل و غارت کو قدر کی نظر سے دیکھتا اور سراہتا ہے لیکن بالکل اسی قسم کی خدمات انجام دینے والے کسی اور ملک (پاکستان) کے مسابقت کرنے والے اداروں کو دہشت گرد اور نان سٹیٹ ایکٹرز کا نام دے کر گردن زدنی قرار دیتا ہے، ان کا ایرک پرنس اپنی کمپنی کا معزز سی ای او ہوتا ہے جبکہ کسی اور کا مدرسے کا ملا (حافظ سعید، مسعود اظہر)، شدت پسند اور دہشت گرد ہوتا ہے جن کے زندہ یا مردہ گرفتاری پر انعام کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اگرچہ دونوں ممالک کی سیکورٹی کمپنیوں کا طریقہ کار اور مقاصد ایک جیسے ہیں یعنی اپنی ریگولر فوج کے نقصانات کو کم کرنا۔

مریم نواز کے ڈگری یافتہ ان پڑھ بچے

دوستو، بزرگو، ساتھیو، کسانو اور محنت کشو جیسے الفاظ سیاستدان عموماً جلسوں میں حاضرین کی توجہ حاصل کرنے کے لئے ادا کرتے ہیں۔ 'میرے بچو'، یہ الفاظ میں نے پہلی دفعہ بیگم نسیم ولی خان کے منہ سے سنے تھے جب اس پردہ دار پختون خاتون کے گھر کے سارے مرد زندانوں میں ڈالے گئے تو وہ دوپٹے کو پگڑی بنا کر نکلی تھیں۔ تب میں نہیں تھا جب مادر ملت جرنیل کے خلاف نکلی تھی لیکن ممکن ہے یہی الفاظ فاطمہ جناح نے بھی ادا کیے ہوں۔ آج جب شریف خاندان کے سارے مرد حوالہ زندان کیے گئے تو شیر مادر جیسے میٹھے یہ الفاظ اب مریم نواز شریف ادا کر رہی ہیں۔

نانی یا دادی ہونا کسی مشرقی خاتون کے لئے بہت بڑا اعزاز ہوتا ہے لیکن یہی اعزاز جب مشیران کم عقل نے مریم نواز کے لئے طعنہ بنا کر بار بار دہرایا تو اس کے جواب میں مریم نے نانی دادی اور ماں ہونے کے اعزازات سینے پر سجا کر بانجھ ماؤں کے دشنام بدہن بیٹوں کے سامنے قوم کے بچوں کو میرے بچے کہنا شروع کیا۔ پہلی دفعہ یہ الفاظ میں نے اس کے منہ سے 'شیر جوان' پروگرام کے افتتاح پر سنے تو بہت اچھے لگے۔ جس کے دوران اس نے موجود نوجوانوں کو آئین اور قانون کی اہمیت سمجھائی اور نصابی کتب میں آئین کو شامل کرنے کی نوید دی، مریم کو یقین ہو گیا ہے کہ سیاست کے الف با سے نابلد بچے سیاست کو دھوکا، سیاستدان کو کرپٹ، آئین کو بازیچہ اطفال اور آئین پامال کرنے والوں کو نجات دہندہ

سمجھتے ہیں، اس لئے جب تک تعلیم یافتہ نوجوانوں میں حقیقی سیاسی بیداری اور آئین و قانون سے محبت اور اس کی اہمیت کا احساس نہیں جگایا جائے گا تب تک یہ سفر جاری رہے گا لیکن ہم یوں ہی گھن چکر میں پھنسے رہیں گے، ہر رہزن رہبر اور ہر سراب منزل لگے گا۔ عزت مآب وقار سیٹھ مرحوم کے جنازے میں کتنے اور مولانا خادم حسین رضوی مرحوم کے جنازے میں کتنے لوگ تھے؟ یہ پاکستان میں سیاسی شعور اور بیداری کا ایک بہت واضح اور خوفناک اشاریہ ہے۔ عمار علی جان پر لگائی گئیں ایم پی او کی دفعات اور اس کے قلم چلانے والے ہاتھوں میں ٹھنڈی ہتھکڑیاں نوجوان نسل کا سینہ کوبی کرتا ہوا نوحہ ہے۔ جسٹس وقار سیٹھ کی تاریخی درجہ بندی کیا ہے اور عمار جان کی جدوجہد کا مقام کیا ہے، ہم میں کوئی نہیں جانتا؟ کوئی جانتا ہے تو ضیاءالحق کے دور میں بڑی منصوبہ بندی سے لائی گئی کرکٹ کی وبا، کھلاڑیوں کے بنائے ہوئے ریکارڈز، ان کے چوکوں چھکوں کی تعداد، جس کا پھل آج ساری قوم کھارہی ہے نیز کھلاڑیوں، اداکاروں اور 'فنکاروں' کی سیاست۔

ضیاالحق لمبے عرصے کے لئے بڑی منصوبہ بندی اور نفسیاتی جنگ کے ماہرین کے ساتھ میدان میں اترا تھا اگر آج تک موجود ہوتا اور سی ون تھرٹی میں بیٹھ کر پرواز نہ کرجاتا تو نہ جانے ہماری کیا حالت ہوتی۔ اس نے تعلیمی اداروں میں سیاسی تربیت پر پابندی لگانے کی خاطر طلبا یونین پر پابندی لگائی تو ساتھ طلبا کیلئے تعلیمی نمک میں پاک سٹڈیز کی ایسی آئیوڈین بھی ملائی جس میں قاتل و مقتول، رہبر و رہزن، ڈکٹیٹر اور جمہور، آئین ساز اور آئین شکن، جناح اور ایوب، جالب اور بوٹ چاٹ، تاریخ اور شربت افیون کا ذکر کچھ اتنا ماہرانہ انداز میں گڈمڈ کیا گیا ہے کہ مجروح اور قصائی دونوں بیک وقت مجرم اور مظلوم لگتے ہیں۔ اس لئے جب مریم نواز نے اسی پروگرام میں ایک نوجوان سے آئین کے بارے پوچھا تو وضاحت کے لیے ساتھ یہ بھی کہا کہ آپ نے ضرور پاکستان سٹڈیز میں آئین کے بارے میں پڑھا ہوگا، آئین اور پاکستان سٹڈیز؟ جناح اور ایوب کی تصاویر ساتھ ساتھ؟ واہ! سیاسی بصیرت اور برسات کا اندھا۔

تعلیم اور علم میں بنیادی فرق بس اتنا ہے جتنا پاکستان سٹڈیز میں موجود آئینی ارتقا کے

باب کا سرسری ذکر اور اس میں ناموجود آئین کیوں نہ بن سکا؟ کس کی وجہ سے نہ بن سکا؟ آئین کے بغیر سرزمین بے آئین کو کیسے کیسے لوٹا گیا؟ پہلے چھوٹے چھوٹے راجواڑوں کے نوابوں، غیر ملکی ایجنٹوں اور بعد میں واجبی تعلیم کے حامل بندوقچیوں نے رہبری کے کون کون سے جوہر دکھائے؟ شکست کھا کر کس کو جھنڈے میں دفن ہونا نصیب ہوا اور آئین دے کر کس کو دار و رسن کے حوالے کر کے عوامی جنازے سے بھی محروم کیا گیا؟ جیسے سوالات کے جوابات سے صرف نظر کیا گیا ہے۔

پاکستان سٹڈیز کے معجزات میں سے ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ ایک ہی شخصیت کے نام کے شروع میں سر اور آخر میں رحمت اللہ علیہ لکھا ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس میں موجودہ پاکستان یعنی سندھ، پختونخوا، بلوچستان اور پنجاب کی کسی انگریز دشمن شخصیت کا تذکرہ ہے نہ عوامی جدوجہد اور قربانیوں کا باب، نیز تعلیم یافتہ بچے اسے پاکستان کی تاریخ سمجھتے ہیں۔

قوم کو غیر سیاسی بنانے کا یہ عمل غیر محسوس طریقے برسوں سے نفسیاتی انداز میں پورے معاشرے میں بڑی شد و مد سے جاری وساری ہے۔ جو بچہ کسی امتحان کو ٹاپ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے میں ڈاکٹر یا انجینئر بن کر قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں، کوئی جناح صاحب کی طرح وکیل اور آئین پسند بننا چاہتا نہ غفار خان اور صمد خان کی طرح قانونی اور انسانی حقوق کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے والا اعلی حوصلے کا مالک سیاستدان، کوئی جسٹس رستم کیانی، جسٹس دراب پٹیل، جسٹس فائز عیسیٰ، جسٹس شوکت صدیقی، جسٹس وقار سیٹھ نہیں بننا چاہتا نہ کوئی عبد الستار ایدھی بننا چاہتا ہے۔

اس معاشرے کو کب اور کس نے سمجھایا ہے کہ 'لائق بچے' اور، عزت والے طلباء 'وہ ہوتے ہیں جو سائنس پڑھتے ہیں اور نالائق صرف آرٹس پڑھنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں؟ جس ملک میں ایک معمولی درجے کا مدر بورڈ نہیں بنتا جہاں پر ایک ادنی آئی سی نہیں بنائی جا سکتی وہاں کے سارے بچے سائنس پڑھ کر قوم کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟ جن کے اکثر اساتذہ نے کبھی خود الیکٹران اور پروٹان کی شکل نہیں دیکھی ہوتی بلکہ جنوں اور پریوں کی کہانیوں کی طرح اپنے وجدان اور چشم تصور کے زور پر کسی ایٹم کے نیوکلئیس پر نیوٹران کی بمباری کا

مجسم نظارہ دیکھا ہو وہ طلبا کو بغیر لیبارٹریز، بغیر سائنسی اوزار اور بغیر سائنسی ذہنیت کے، رٹے کے علاوہ اور زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کے علاوہ کیا سکھا سکتے ہیں؟ پاکستان کوئی کوریا چین یا جاپان ہے جہاں متجسس بچوں کے پاس ذاتی ورکشاپ ہوتے ہیں؟ ہمارے بچے تو موبائل کمپیوٹرز ٹیبلیٹ اور انٹرنیٹ بھی تضیع اوقات کے لئے استعمال کرتے ہیں، یہاں جو ایک دو سائنس دان ڈاکٹر عبدالسلام اور قدیر خان کہیں سے پیدا ہوئے تو ان کا ہم نے جو حشر کیا، تو اب بھی سائنس کا کوئی مستقبل ہے؟ سائنس ہمیں کچھ بھی نہ دیتی بس ہماری فکر پر تنے ہوئے فرسودگی اور جہالت کے جالے اتار دیتی تو پندرہ بیس سال میں ممکن تھا ہم کچھ کرنے کے قابل ہو جاتے لیکن طارق جمیلوں اور حماد صافیوں کے لیکچروں نے وہ بھی ہونے نہیں دیا۔

بس ایک بات سمجھ آتی ہے کہ 'لائق بچے' آرٹس نہ پڑھیں کیوں کہ وہاں پر سیاسیات، عمرانیات، سوکس، اقتصادیات، بشریات، نفسیات، ایڈمنسٹریشن، بزنس، اخلاقیات، تقابل ادیان، تاریخ، فلسفہ، آئین سازی، قانون سازی، غرض زندگی گزارنے کا ہر فن اور 'سائنس' سکھایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے رنگ رنگ کے نظریات، تنقیدی فکر، فلسفیانہ بحث ومباحثہ، فکری فرسودگی کا علاج، سیاسی اقتصادی معاشی اور بیشمار معاشرتی جہتیں، نظام کہنہ کے لئے تیشے، بزعم خود دانشوروں کی کوتاہ قد دانش ناپنے کے پیمانے، انسانی سیاسی اور آئینی حقوق کی اہمیت، کوتاہ بینی اور سیاسی پسماندگی کے نقصانات پر نقد و نظر ملتی ہے اور جہاں پر یہ سب سکھایا جاتا ہو وہاں پر قابل بچے آ گئے تو پھر نہ یہ نظام کہنہ رہے گا نہ غازی اور مجاہد کی تقدس، کہ علم اوہام کا دشمن ہے اس لیے تو اوہام ڈراتے پھرتے اور دندناتے ہیں۔ ہمیں کوئی نہیں بتاتا کہ سائنس اشیاء کا علم ہے اور آرٹس اشیاء کو کام میں لانے والے انسانوں کا۔

ٹی وی مباحثہ کا کنڈکٹر ہو یا اخباری اداریہ لکھنے والا، سیاسی الجھنیں سلجھانے والا مدبر ہو یا اقتصاد کو راہ راست پر ڈالنے والا، سلطنتیں اور اقوام کی رہبری کرنے والے ہوں یا افواج کے کمانڈر، کروڑوں میں معاوضہ وصول کرنے والا اداکار ہو اور کروڑ ہا ذہنوں کو متاثر کرنے والا موسیقار، گلوکار یا ہدایت کار، سارے کے سارے نہ بھی ہوں تو اکثریت آرٹس والے

ہوتے ہیں، جب لائق بچے ان میدانوں میں آئیں گے تو پھر کوئی نہیں کہہ سکے گا کہ ہمارا اقتصاد خراب ہے، عدلیہ خراب ہے، قانون شکنی اور آئین شکنی پسند کی جاتی ہے، سیاست میں موروثیت ہے، بالادستوں کی فکر میں خلل ہے، وکلا اور ججز قانون شکن ہیں۔

کبھی آپ نے سنا ہے کہ اس ملک میں فزکس خراب ہے، کیمسٹری کی کمیابی ہے، بیالوجی ناپید ہے؟ ہر کوئی سیاست، اقتصاد، قانون، ناانصافی، اقربا پروری، انسانی سیاسی اور بشری حقوق کی پامالیوں کا رونا روتا ہے، اس لئے مریم کو حکومت ملی تو اپنے 'شیر جوانوں' کو پاکستان سٹڈیز کی بجائے تاریخ فلسفہ سیاسیات آئین حقوق و فرائض اور تاریخ کے راستے پر ڈالنا ہوگا، تعلیمی نظام درست کرنا ہوگا، ورنہ ممکن ہے اپنے والد کی طرح انہیں بھی حکومت مل جائے گی لیکن ہمیں منزل نہیں مل سکے گی۔

جب تک مریم نواز کے تعلیم یافتہ ان پڑھ بچے جو 'سائنس' کے پیچھے لگائے گئے ہیں نیز سائنسی سوچ سے محروم رکھے گئے ہیں، قانون، سیاسیات، اقتصاد، فلسفہ، سوکس، سماجیات اور بشریات نہیں پڑھیں گے، جب تک سماجی علوم (آرٹس) پڑھنے والے بچوں کو معاشرہ باہر اور گھر والے اندر عزت نہیں دیں گے، مریم خود بھی آئین کی مثالیں پاکستان سٹڈیز میں ڈھونڈیں گی اور نوجوان بھی انسانی آئینی حقوق اور آئین اور قانون کی اہمیت صابر شاکر، حسن نثار اور سمیع ابرہیم جیسے دانشمندوں سے سیکھیں گے۔ خمینی صاحب جلاوطن ہو کر بھیجے جا رہے تھے تو ایک اخبار والے نے طعنہ دے کر پوچھا کہ کہاں ہے تیرا انقلاب؟ اس نے جاتے جاتے جواب دیا تھا کہ ابھی ماؤں کی گود میں ہے۔ مریم نواز کا انقلاب تو ابھی ماؤں کے دماغ میں بھی نہیں۔

پروپیگنڈے کی طاقت

برطانوی مدبر اور سیاست دان بنجمن ڈسرائیلی نے کہا ہے کہ میں الفاظ کی طاقت سے لوگوں پر حکومت کرتا ہوں۔ جو کچھ ہم روزانہ دیکھتے سنتے یا پڑھتے ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ ہم یہی دیکھنا سننا اور پڑھنا چاہتے ہیں لیکن یہ ہماری غلط فہمی ہوتی ہے کیونکہ ہمارے دیکھنے سننے اور پڑھنے میں وافر حصہ اس کا ہوتا ہے جو ہمیں کسی نے ایک خاص مقصد کے پیش نظر سنایا، دکھایا اور پڑھایا ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے آپ ابھی یہی سمجھتے ہیں کہ اپ یہ سب اپنی مرضی سے پڑھ رہے ہیں لیکن میں آپکو نہ صرف یہ سب اپنی مرضی سے پڑھا رہا ہوں بلکہ میرا آپ کو پڑھانے کا ایک اہم مقصد بھی ہے، میں آپکو اپنے خیالات نہ صرف یہ کہ منتقل کر رہا ہوں بلکہ آپ کو اپنے خیالات کے ساتھ متفق کرنے پر قائل بھی کر رہا ہوں۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس تیز رفتار دور میں جو کچھ ہم سنتے ہیں دیکھتے ہیں اور پڑھتے ہیں اس کا غالب ترین حصہ بامقصد پروپیگنڈے پر مشتمل ہوتا ہے، جس کی مختلف شکلیں، اشتہارات، فلمیں، ڈرامے، پبلسٹی، پی آر، سیاسی پارٹیاں، کتب، میگزینز، خبریں، اخبارات، سیمینارز، ورکشاپس، ٹریننگ سیشنز، ریفریشر کورسز، تعلیمی ادارے، ٹاک شوز، انٹرویوز، گیمز، ٹورنامنٹس، افتتاحی تقاریب، تبلیغی اور معلوماتی ایونٹس، حب الوطنی پر مشتمل گانے اور ریڈیو، ٹی وی کے پروگرام ہوتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ تعلیمافتہ افراد کے مقابلے میں کم تعلیمافتہ یا ناخواندہ افراد پروپیگنڈے سے زیادہ اور آسانی سے متاثر ہوں گے لیکن حقیقت اس

کے بالکل برعکس ہے۔ پروپیگنڈے سے متاثر ہونے والوں کی اکثریت لکھی پڑھی اور تعلیمافتہ ہوتی ہے اس لئے کہ لکھے ہوئے مواد میں اسی فیصد سے زیادہ مواد پروپیگنڈے کی مقصد سے بنایا جاتا ہے اور خواندہ افراد کی پڑھنے کی صلاحیت اور عادت کی وجہ سے وہ سب سے زیادہ اور آسانی سے اس پروپیگنڈے کے شکار ہوتے ہیں۔ اگر ناخواندہ پروپیگنڈے کا شکار ہوتا تو ناخواندہ کیسے رہتا؟ پھر لکھا پڑھا صرف خود پروپیگنڈے کا شکار نہیں ہوتا وہ پروپیگنڈے کا ذریعہ بھی بنتا ہے، وہ اپنے معلومات (پروپیگنڈا) دوسروں کے ساتھ اس نیت کے ساتھ شئیر بھی کرتا ہے کہ وہ لکھا پڑھا ہے اور دوسروں سے زیادہ جانتا ہے، نیز وہ ان معلومات کو اپنا ماہرانہ رائے اور تجزیہ بنا کر بھی پیش کرتا رہتا ہے اور دوسرے یعنی کم تعلیمافتہ یا ناخواندہ افراد اس پڑھے لکھے فرد سے یہ سب سننے کے بعد اس پر یقین بھی آسانی سے کر لیتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں انہوں نے یہ سب کچھ ڈاکٹر صاحب سے، انجنئیر صاحب سے، پروفیسر صاحب سے اور استاد جی سے سنا ہوا ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا ذرائع کے ساتھ ساتھ پروپیگنڈے کے لئے معاشرتی آئیکون بھی استعمال میں لائے جاتے ہیں، جن میں عموماً فلموں اور ڈراموں کے اداکار اور کھلاڑی شامل ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ آئیکون معاشرے میں قدرتی طور پر بنے بنائے ہوتے ہیں اور کچھ کو باقاعدہ پروپیگنڈے کے زور بنایا جاتا ہے، جو آگے جاکر خود پروپیگنڈے کی مشینری کے اہم اوزار بنتے ہیں، مثلاً کسی ایک مخصوص اداکار یا اداکارہ کے بارے میں، مشہور ترین لکھنے والے، مقبول ترین اخبارات میں، مثبت اور شاندار تبصرے لکھتے ہیں، ان کی اداکاری اور شخصیت کو افسانوی اور بے مثال بنا کر پیش کرتے ہیں ان کے لئے مخصوص، رنگ برنگے اور زبردست کردار لکھے جاتے ہیں، بے انتہا دولتمند پروڈیوسرز ان کی فلموں اور ڈراموں پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں اور یوں وہ محیر العقول افسانوی کرداروں میں ڈھالے جاتے ہیں، پھر ان افسانوی کرداروں کی زندگی کے بارے میں پل پل کی خبریں تیار کرکے چھاپی جاتی ہیں، ان کی ہر فلم اور ڈرامے کو ناظرین کے لئے اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ ناظرین ہر حال میں ان کو دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور زیادہ لوگوں کے دیکھنے کے اس عمل کو پھر اس فلم اور ڈرامے کی کامیابی کی ضمانت کے طور پر پیش

کیا جاتا ہے، وہ مشہور اخبارات اور فلمی ہاوسز یا تو ایک کمپنی یا فرد کی ملکیت ہوتے ہیں یا ان کے کاروباری مفادات باہم منسلک ہوتے ہیں۔ ان اداکاروں کو ناظرین مسلسل اپنے گھروں کے افراد کے ساتھ اپنے گھروں کے اندر دیکھتے دیکھتے غیر محسوس انداز میں نہ صرف اپنی زندگی کا حصہ اور گھر کا فرد سمجھنے لگتے ہیں، بلکہ وہ انکے آئیڈیل فرد بن جاتے ہیں۔ بات یہاں پر ختم نہیں ہو جاتی، ناظرین ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے وقت، دولت اور توانائیاں خرچ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ پھر ان ائیکون کو تیار کرنے والے سنڈیکیٹ اور ٹائیکون ان کے ذریعے ان کے کروڑوں چاہنے والوں کو ہپنٹائز کر کے ان کے ساتھ وہی عمل کرتے ہیں جو سڑک کے کنارے چادر کے نیچے لیٹے ہوئے شخص اور ہپناٹزم کے ماہر کے پاس کھڑے بچہ جمہورا تماشبینوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ بنائے گئے ان محیر العقول کرداروں کی ایک ایک ادا کو پسند کیا جاتا ہے، گھنٹوں ان کا انتظار کیا اور کروایا جاتا ہے، ان کے ہئیر اسٹائل اور کپڑوں کی ڈیزائن اور زندگی گزارنے کے طور طریقے کاپی کیے جاتے ہیں اور یوں ان کی اپنائیت میں، غیر محسوس طور پر ان کی ہر بات اپنائی جاتی ہے، وہ کسی کار بنانے والی کمپنی کی کار کی تعریف (اشتہار میں) کرتا ہے تو کروڑوں لوگ وہی کار پسند کرنے لگتے ہیں، جس کولڈ ڈرنک کو پیتے ہوئے وہ پسند (اشتہار میں) کرتا ہے، وہی کولڈ ڈرنک لمحوں میں کروڑوں چاہنے والوں کی پسند بن کر بکنے لگتی ہے، جس ڈٹرجنٹ پاؤڈر کو بہترین کہتا ہے وہی خریدا جاتا ہے۔ یوں جس مقصد کے لئے بنانے والوں نے اسے آئیکون بنایا تھا وہ وہی مقصد پورا کرتا رہتا ہے، اگر ائیکون بنانے پر بنانے والوں کے لاکھوں خرچ ہوئے ہوں تو کروڑوں کماتے ہیں اور کروڑوں خرچ ہوئے ہوں تو اربوں اکٹھے کیے جاتے ہیں۔

اداکاروں کی طرح کھلاڑی بھی کچھ فطری اچھے ہوتے ہیں اور کچھ اچھے بنائے جاتے ہیں۔ ان خاص کھلاڑیوں کو پبلسٹی دے کر ٹارگٹ کیا جاتا ہے، ان کو ہیرو بنا کر ٹاک شوز، نیوز بلٹنز اور سوشل ایونٹس میں بار بار پیش کیا جاتا ہے، ان کے لئے مخالف ٹیم کے کھلاڑی خریدے جاتے ہیں، میچز فکس کیے جاتے ہیں، ان کو جتوایا جاتا ہے، ان کو ناقابل یقین صلاحیتوں کے مالک اور ملک و ٹیم کے لئے ناگزیر باور کرایا جاتا ہے اور جب وہ کروڑوں

ناظرین کے دلوں کے دھڑکن بن جاتے ہیں تو وہی مقصد ان سے بھی پورا کیا جاتا ہے جو اداکاروں سے پورا کیا جاتا ہے، پھر وہ بھی کسی اشتہار میں ایک جھلک دکھانے اور بل بورڈز پر کسی پروڈکٹ کے کروڑوں وصول کرتے ہیں اور ان کے بنانے والے بھی اربوں کھربوں اکٹھا کرتے ہیں۔

ان آئیکونز کے لئے لکھے گئے کردار انسانی رویوں کو تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ، انسانی معاشروں کو تبدیل کرنے کے تجربات میں بھی کامیابی کے ساتھ استعمال ہو رہے ہیں اور یہی اداکار اور کھلاڑی کارخانوں کی بنی ہوئی آشیاء کے ساتھ ساتھ نظریات اور خواب بھی بیچنے لگتے ہیں، جن کی مشہور مثالیں، امریکی صدر ریگن (اداکار اور سیاستدان) اور شوازنیگر (اداکار اور سیاستدان) یوکرینی صدر ولادیمیر ذیلنسکی (کامیڈن اور سیاستدان) اور ہمارے اپنے عمران خان (کھلاڑی اور سیاستدان) ہیں۔ اگر میں اپکی توجہ عمران خان کے کھیل اور متاثر کن شخصیت سے تھوڑی دیر کے لئے ہٹا کر ان کی سیاسی جماعت تحریک انصاف کی تیاری اور مقبول بنانے کی مہم طرف مبذول کرادوں تو اپ حیران ہو جائیں گے کہ تحریک انصاف کو مقبول بنانے کی مہم ڈکٹیٹر مشرف کی زوال کے مہم کا حصہ تھا، جب مشرف ڈوبتے سورج کے ساتھ افق میں گم ہو رہا تھا تو اس کے ساتھ ساتھ تحریک انصاف کی مہم بھی چلائی جارہی تھی۔ جب وکیل چیف جسٹس افتخار چودھری کی بحالی کی مہم کے لئے انصاف انصاف کی دھائی دے رہے تھے وہ دراصل تحریک انصاف، تحریک انصاف پکار رہے تھے۔ چوہدری افتخار، منصف اعلیٰ کو انصاف کی ضرورت تھی، انہیں بحال کر کے انصاف کا بول بالا کیا جانا تھا، چوہدری افتخار، دبنگ انداز میں انصاف کی کرسی پر واپس ہوئے، ان کی عدالت میں ملزم اور مجرم کانپتے تھے اور انصاف بولتے ہوئے گونجتا تھا، اخبارات اور ٹی وی پر ان کے لئے انصاف مانگا گیا، پھر وہ خود روزانہ خبروں میں انصاف کرتا نظر آتا رہا، اس دور میں انصاف انصاف کے الفاظ اے نے تواتر سے سماعتوں سے ٹکراتے رہیں، بولے جاتے رہے، لکھے جاتے رہیں کہ انصاف معاشرے کا سب سے بڑا ٹاپک اور استعمال ہونے والا لفظ بنایا گیا۔ آپ کو یقین نہیں، تو ٹھیک ہے۔

میری طرح آپکو بھی فلموں ڈراموں اور ٹی وی پروگراموں کے درمیان اشتہارات اچھے نہیں لگتے، اپ بھی اشتہارات کے دوران چینل تبدیل کر دیتے ہیں یا عارضی طور پر کوئی دوسرا کام کرنے لگتے ہیں اور اشتہار گذرنے کے بعد پھر اپنا پسندیدہ چینل دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک اشتہار عموماً تیس پینتیس سیکنڈ کے دورانیے کا ہوتا ہے جس کو آپ کبھی کبھار لمحہ بھر کے لئے دیکھ بھی لیتے ہیں لیکن جب آپ کو گھر میں نہانے کا صابن بازار سے خریدنے کے لئے کہا جاتا ہے تو آپ دکاندار سے نہانے کا صابن نہیں مانگتے بلکہ مخصوص نام کا صابن مانگتے ہیں، جب آپکو ڈیٹرجنٹ پاوڈر لانے کا کہا جاتا ہے تو آپ ڈیٹرجنٹ پاوڈر نہیں ایک مخصوص نام کا پاوڈر مانگتے ہیں۔

سوچئے اشتہارات آپ کو پسند نہیں اور آپ دیکھتے بھی نہیں لیکن پھر بھی اشتہار میں بتائے گئے اور دکھائے گئے پروڈکٹ خرید لاتے ہیں تو جو کچھ آپ، آپ کے خیال میں، اپنی مرضی سے غور کے ساتھ کئی گھنٹوں تک دیکھتے، پڑھتے اور کہتے ہیں، اس کا آپکے ذہن، رویوں اور پسند ناپسند پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہوں گے؟ یوں انصاف انصاف کی گردان کرتے، کہتے، سنتے، پڑھتے، تحریک انصاف کو ہر شخص، ہر گھر اور ہر دل تک پہنچایا گیا۔

ایک سریلا ہندوستانی گانا یاد آیا۔ آدمی جو کہتا ہے، آدمی جو سنتا ہے، زندگی بھر وہ صدائیں پیچھا کرتی ہیں۔

ایک اشتہار میں دو چھوٹے بچے فٹبال کے ساتھ کیچڑ میں کھیلتے ہیں، ماں گندے بچوں اور گندے کپڑوں سے فکر مند ہو کر ان کو کھیلنے سے روکتی ہے، اتنے میں ایک عقلمند اور خوش پوش خاتون آکر ماں کو سمجھاتی ہے کہ بچے کھیل کھیل میں سیکھتے ہیں، داغ تو اچھے ہوتے ہیں اور دھلائی کے لئے فلاں ڈیٹرجنٹ پاوڈر ہے نا۔

ایک اور اشتہار میں دو بچے مٹی میں کھیلتے ہیں، ماں بے فکری سے اپنے کام میں مگن ہے، ایک عقلمند اور خوش پوش عورت آتی ہے، عدسہ نکال کر ماں کو مٹی میں موجود خطرناک جراثیم دکھاتی ہوئی کہتی ہے، بچوں کو مٹی میں نہ کھیلنے دیں، کیونکہ مٹی میں موجود مہلک اور خطرناک جراثیم بچے کو بیمار کرسکتے ہیں، لیکن فکر کی کوئی بات نہیں، فلاں صابن کے ساتھ

نہانے سے سارے جراثیم مر جاتے ہیں۔ ہم ان دونوں اشتہارات اور عدسے کے ذریعے جراثیم کے نظر آنے پر یقین کر لیتے ہیں اور ان کے زیر اثر بتائے گئے پروڈکٹس بھی خریدتے ہیں جبکہ یہ دونوں اشتہارات مختلف حقائق بیان کرتے ہیں۔ پہلا مٹی میں کھیلنے کو بچے کے لئے صحت مند سرگرمی بتاتا ہے اور دوسرا مٹی میں کھیلنا بچے کے لئے مہلک اور خطرناک بتاتا ہے، اور زبردست حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں اشتہارات ایک ہی ادارے کی اشیائے صرف کے لئے استعمال کیے جاتے ہیں۔

ہمارے رویوں کو تبدیل کرنے کے ساتھ اشتہارات اب ہمارے عقائد کو بھی تبدیل کر رہے ہیں، دس بیس بیماریوں کی ذمہ داری پرانے وقتوں میں کسی صابن کے پاس نہیں تھی یہ اعزاز پہلے کچھ روحانی ہستیوں کو حاصل ہوتا۔

امریکہ پنٹاگون کے زور پر جو جنگیں ہار جاتا ہے پروپیگنڈے یعنی ہالی ووڈ زور پر وہ ساری جنگیں جیت جاتا ہے اور انڈیا بالی ووڈ کے زور پر وہ جنگیں بھی جیت جاتا ہے جو اس نے کبھی لڑی بھی نہیں ہوتی۔ پروپیگنڈے کا جادو یہ ہے کہ وہ ساری جنگیں جو حقیقت میں امریکی جنگیں ہیں، ان کو ویتنام کی جنگ، کوریا کی جنگ، افغانستان کی جنگ، عراق کی جنگ، شام کی خانہ جنگ اور دہشت گردی کی جنگ کہا جاتا ہے۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا، لیکن خواتین کا دوپٹہ اور چادر کسی تحریک یا این جی او کی کوششکی وجہ سے ان کے سر سے نہیں اترا بلکہ یہ پانچ روپے کے شیمپو کے اشتہار نے اتارا ہے، چونکہ دوپٹہ یا چادر پہن کر کوئی لڑکی یا خاتون اپنے چمکتے، لمبے اور جاندار بال کسی کو نہیں دکھا سکتی اس لئے شیمپو کے اشتہار میں کام کرنے والی ماڈل کی طرح اس نے اپنے بال دکھانے کیلئے اپنا چادر اور دوپٹہ اتار دیا۔ یقین نہ آتا تو شادی والے گھر میں خواتین کے پورشن پر ایک تنقیدی نظر دوڑائیں۔ یہی حالت ہیر ریمور کریم کی ہے، جس کو جب ٹانگوں اور بازوں پر لگایا جاتا ہے تو پھر خواتین کو ٹانگیں اور بازو ننگیں کرنے پڑتے ہیں خواہ سردیاں ہوں یا برف باری ہو رہی ہو۔

پروپیگنڈے ہی کے زور پر نور جہاں ملکہ ترنم، مہدی حسن شہنشاہ غزل، نصرت فتح علی خان قوال اعظم اور علامہ اقبال شاعر مشرق کہلاتا ہے اور مختلف قسم کے سارے غدار

چھوٹے صوبوں میں پائے ہیں، جبکہ یہ سارے پنجابی زبان میں گانے کی وجہ سے مقبول اور خطاب یافتہ ہیں۔ کیا موسیقی یا گائیگی کا کہیں پر کوئی مقابلہ منعقد کیا گیا تھا جہاں پر ان سب کو اعلیٰ برتر اور بہتر قرار دیا گیا یا کسی سائنسی لیبارٹری میں تجربات کر کے ان کی موسیقی اور آواز کو دوسروں سے بہتر پایا گیا؟ چونکہ پروپیگنڈے کے ذرائع یعنی ٹی وی، ریڈیو، اخبارات، فلم اور ڈرامے کے مراکز اور پرموٹرز زیادہ تر پنجاب میں اور پنجاب سے ہیں اس لیے سارے خطابات اور القاب آپس میں بانٹے گئے۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ سندھ کے گلوکاروں اور موسیقاروں کے کیا نام ہیں؟ بلوچستان میں گائیگی کے استاد اور موسیقی کے کون سے نابغے رہتے ہیں اور پختونخوا میں کون سی سریلی آوازیں کوکتی اور دل موہتی ہیں اور کون سے تان سین رہتے ہیں؟ پھر مشرق کیا رن آف کچھ سے دیوسائی تک ہے یا چین، جاپان، منگولیا، شمالی اور جنوبی کوریا، سنگاپور، ویتنام، تھائی لینڈ، تائیوان، کمبوڈیا، برونائی، آرمینیا، بھوٹان، سری لنکا، بنگلہ دیش، انڈیا، لاؤس، افغانستان، تاجکستان، ازبکستان، ترکمنستان، کرغیزستان، نیپال، مالدیپ، مکاؤ، آذربائیجان، روس، ترکی، سعودی عرب، عرب امارات، کویت، یمن، اومان، بحرین، قطر، فلسطین، اسرائیل، اردن، لبنان، ایران اور عراق وغیرہ بھی مشرق میں نہیں ہیں؟ ان مشرقی ممالک کے ہاں کون سے شاعر ہیں؟ کیسی شاعری کرتے ہیں؟ کیا ہم انہیں جانتے ہیں؟ کیا ہم ان کو پڑھے ہوئے ہیں یا ان کو سمجھتے ہیں؟ اگر نہیں، تو پھر شاعر مشرق کے لئے کس میدان اور کون سے دنگل میں ہم نے شاعر مشرق کا ٹائٹل جیتا تھا؟

جان سنو: آپ بھی کچھ نہیں جانتے

جان سنو، سنو وائٹ کا کوئی رشتہ دار نہیں، سنو وائٹ کا تعارف بھی کسی اور دن۔ لیکن جان سنو کی کہانی پریوں کی نہیں بلکہ ہماری کہانی ہے۔ جان سنو، گیم آف تھرونز ڈرامے کا ہزاروں کرداروں میں سے ایک غیر اہم کردار تھا، جو ڈرامے کے اختتام پر زندہ بچ کر سب سے اہم بن گیا تھا۔ زندہ بچ جانا ویسے بھی سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔

کہانی کے مطابق جان سنو پر وائلڈ لنگز یا فری فوک کی ایک خوبصورت لڑکی ایگرٹ دل و جان سے فدا ہو جاتی ہے، جو مسلسل اس کوشش میں ہوتیہے کہ وہ جان سنو، کے آس پاس رہے، وہ ہر سین میں اسے ایک مشہور جملہ بولتی رہتی ہے کہ جان سنو یو نو نتھنگ، یعنی جان سنو تم کچھ بھی نہیں جانتے۔ یہاں تک کہ اپنی جان، جان سنو، پر وارتے ہوئی بھی اس کا آخری جملہ یہی ہوتا ہے کہ جان سنو، تم کچھ بھی نہیں جانتے۔ اور یہی حالت ہماری بھی ہے، ہم میں سے ہر ایک جان سنو ہے اور ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔ آڈیو ویڈیو لیک کا جو موسم آیا ہوا ہے اور جس پر کچھ ماہرین جانتے ہوئے اور کچھ انجانے میں قوم کو گمراہ کر رہے ہیں ممکن ہے وہ بس اتنا بتا سکتے ہوں جتنا ان کے علم میں ہے، یا جتنا انہیں بتانے کا اختیار ہے کہ یہ لیک کہاں سے آ رہی ہیں۔

الیکٹرانک کمیونیکیشن اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس ادور میں، جب ہر کسی کی جیب میں سمارٹ فون، بیگ میں لیپ ٹاپ یا ٹیبلٹ پڑا ہوتا ہے، اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس کا ڈیٹا،

پیغامات، انٹرنیٹ براؤزنگ، فلم بینی، ذاتی فائلوں اور تصاویر کا تبادلہ اور فون پر باتیں کرنا کوئی نہیں دیکھتا یا سنتا یا جب وہ یہ سب کرتا ہے تو ان سب تک کسی اور کی رسائی نہیں ہوتی تو وہ جان سنو ہے، ایگرٹ بن کر کوئی جتنا بھی اسے احساس دلائے کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے، وہ یقین نہیں کرے گا، کیونکہ ہم واقعی نہیں جانتے کہ کون کون کہاں کہاں ہمیں دیکھتا سنتا جانچتا اور ہماری نگرانی کرتا ہے؟

جس فون کو ہم الگ ہو کر تنہا سنتے ہیں، پاسورڈ لگا کر جس موبائل فون اور کمپیوٹر کو ہم محفوظ کرتے ہیں، وی پی این اور فائر وال کے پیچھے چپ کر ہم جو نیٹ سرفنگ کرتے ہیں، جو ذاتی پیغامات ہم ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کرتے ہیں، بنک اکاؤنٹ نمبر اور اے ٹی ایم پاسورڈ، گاڑی کے ٹریکر کو لاک ان لاک کرنے کے معلومات، الیکٹرانک سیکورٹی لاکس اور والٹ پاسورڈ، ان میں کچھ بھی کبھی بھی محفوظ نہیں ہوتا۔ بس ایک اندھا اعتماد ہے جس نے ہمیں محفوظ ہونے کا احساس دلایا ہوا ہے۔ اس لیے یہ سوچنا کہ وزیراعظم ہاؤس کے موبائل کیسے ہیک ہوئے یا میٹنگ روم کیسے بگ ہوئے یا اتنی وی آئی پی شخصیات اور اتنے محفوظ میٹنگ کی باتیں کیسی سنی اور ریکارڈ کی گئی اس بات کا ثبوت ہے کہ جان سنو کچھ بھی نہیں جانتا۔

نادرا پاکستانیوں کی معلومات کا ایک ایسا خزانہ ہے جس کا دروازہ کھلا ہوا، کواڑ ٹیڑھے، قبضے نکلے ہوئے جبکہ چابیاں گم ہو گئی ہیں۔ ایسی معلومات کے کتنے گاہک ہیں اور اس کے لئے وہ کتنی رقم خرچ کرنے کے لئے تیار ہیں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا، لیکن یہ معلومات کتنی آسانی سے دستیاب ہیں، بندہ جان سنو نہ ہو تو ضرور جان سکتا ہے۔ پاکستان بھر کے بنکوں میں یہ ڈیٹا دستیاب ہے، نادرا کے کیاسک دفاتر میں یہ پڑا ہوا ہے، گاڑیاں رجسٹر کرنے والوں کی اس تک رسائی ہے، تو ڈیٹا چرانے والوں کے لئے کون سا مشکل ہے جو وسائل کے مالک اور جان سنو سے زیادہ علم و ہنر رکھتے ہیں۔ نادرا کے بھاگے ہوئے ملازمین اور چرائے گئے ڈیٹا کے بارے میں خبریں ملکی اور غیر ملکی اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں، تبھی تو ڈارک ویب پر ہمارا ڈیٹا لونڈے کے مال کی طرح بک رہا ہے۔

ساری دنیا کسی شہری کے فنگر پرنٹس تب ریکارڈ کیے جاتے ہیں جب وہ کسی جرم میں

ملوث ہو جائے اور جج یا قانون اجازت دے جبکہ پاکستان میں ہر کوئی مجرم سمجھا جاتا ہے اور ہر کسی کے فنگر پرنٹس نادرا کے غیر محفوظ ریکارڈ کا حصہ ہیں۔ اب نہیں پتہ کہ یہ ہماری ضرورت ہے یا کسی اور کو محفوظ بنانے کی خاطر ہمارے حکمرانوں نے ہمیں عدم تحفظ کا شکار کیا ہوا ہے۔

سارے غیر ملکیوں کے پاس قابل اعتماد اور قابل قبول دستاویز اس کے ملک کا مہیا کیا گیا پاسپورٹ سمجھا جاتا ہے لیکن پاکستانی کے پاس بیرون ملک پاسپورٹ کے علاوہ ایک عدد نائیکوپ بھی ہوتا ہے، جس کے بارے میں کوئی نہیں بتاتا کہ یہ کیوں ضروری ہے اور جان سنو کو بھی اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ جان سنو کو دلچسپی نہ بھی ہو تو سوال یہ ہے کہ نادرا ملازمین، نادرا ریکارڈ تک رسائی رکھنے والے بنک ملازمین اور نادرا کیاسک کے مالکان کی سیکورٹی کیلئر نس کتنی ہے؟ کس نے کی ہے؟ اور ان پر نگرانی رکھنے کا کیا انتظام ہے؟

جان سنو کی کم علمی عدم دلچسپی یا محفوظ ہونے کے اعتماد کا سبب یہ بھی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ کوئی درجن بھر خفیہ اور ظاہر ایجنسیاں اس کی حفاظت پر مامور ہیں، اور یہ سچ بھی ہے۔ لیکن گزشتہ چند سالوں سے جس طریقے سے موجود اور اکٹھا کیا گیا ڈیٹا جس مجرمانہ طریقے سے سیاسی مقاصد کے لئے، عقلی طور پر دیوالیہ ایک شخص کے لئے استعمال کیا گیا اس کے بعد جان سنو کے پاس تحفظ کا احساس محض اس کا واہمہ ہے۔ عمران خان اور شیخ رشید تاریخی دھرنے کے دوران جو جو پیشگوئیاں کرتے رہے وہ ٹھوس معلومات پر مشتمل تھیں۔

جاوید ہاشمی نے پی ٹی آئی سے الگ ہو کر جو کہا وہ سو فیصد درست ثابت ہوا، شیخ رشید آج بھی سیاسی ولی اللہ بنکر ججوں کے فیصلوں اور اسٹیبلشمنٹ کے موو ز کے بارے میں دس دن پہلے درست پیشگوئیاں کرتا رہتا ہے، کیا کسی نے کبھی ان لیکس کی انکوائری کروائی یا اس کے بارے میں پوچھ گچھ کی ہے کہ یہ معلومات اسے کہاں سے ملتی ہیں؟ کیا کسی نے اس بات کی تردید کرنا مناسب سمجھا کہ شیخ رشید کسی بھی نمبر کے گیٹ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا؟

ٹی وی پروگرامز اور ذاتی ویڈیوز بلاگز میں کئی "نامی گرامی" اینکرز ویلاگرز اور یوٹیوبرز نے کئی بار ببانگ دہل کہا کہ انہیں فائلیں اور فلمیں دکھائی جاتی تھیں اور معلومات شیئر کی جاتی تھی، کیا ان یوٹیوبرز اور وی لاگرز کی سیکورٹی کلیئر نس اس لیول کی تھی جس لیول

کا ڈیٹا ان کے ساتھ شیئر کیا گیا تھا؟ کیا ایسا ڈیٹا اس لیول کے لوگوں کے ساتھ شیئر کرنا مناسب تھا جن کا کام صرف بولنا ہے؟ کیا یہ ضروری نہیں کہ جان سنو یہ جان لے کہ ایسا کیوں اور کس نے کیا تھا؟

جان سنو نے کئی بار عمران کو تقریروں میں یہ کہتے ہوئے سنا ہو گا کہ میں ایماندار ہوں کیونکہ آئی ایس آئی میرے فون سنتی اور ریکارڈ کرتی ہے، لیکن جان سنو نے کبھی نہیں جانا کہ کیا آئی ایس آئی کو اپنا فون ریکارڈ کرنے کی اجازت عمران خان نے دی تھی یا عمران خان کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا فون ریکارڈ ہوتا ہے اور وہ ان کو شرمندہ کرنے کے لئے ایسے بیانات دیتا تھا؟ ان بیانات کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ کیا عمران خان کسی کو اپنی تقاریر کے ذریعے پیغام دینا چاہتا تھا کہ مجھے فون نہ کریں، آئی ایس آئی میرے فون سنتی ہے؟

عمران خان کے لئے تیار کردہ سینکڑوں دنوں پر محیط دھرنے کے دوران آئی بی نے جنرل ظہیر السلام کے فون ریکارڈ کر کے وزیراعظم کو پیش کیے جس میں وہ حکومت کے خلاف دھرنے والوں کو ہدایات دے رہا تھا، نواز شریف نے وہ ٹیپ جنرل راحیل شریف کی موجودگی میں سنائیں تو عمران خان نے حکومت ملنے کے بعد آئی بی کو مزید اڑان بھرنے سے روکنے کی خاطر لنگڑی بطخ بنا کر محدود مالی معلومات اکٹھا کرنے پر لگا دیا۔ کیونکہ ماضی میں بھی آئی بی نے سینیٹر گل شیر کے گھر میں بینظیر کی حکومت گرانے کی خاطر منتخب حکومتی اراکین کی وفاداریاں بدلنے کے لیے بریگیڈیئر امتیاز اور میجر عامر کے خلاف کامیاب آپریشن کیا تھا۔

پاکستان میں انٹیلیجنس معاملات کے ساتھ سویلین کا کوئی کام نہیں ہوتا کیونکہ زیادہ تر انٹیلیجنس سویلین کے خلاف اکٹھی کی جاتی ہے، اس لیے آئی بی، جو انگریز کے دور میں ایک ہیبت ناک اور کارآمد ادارہ تھا پاکستان ریلوے کی طرح بیکار کر دیا گیا۔

عمران خان اسٹیبلشمنٹ کے جس اندرونی حلقے اور معلومات تک رسائی رکھتا تھا یہ عین ممکن ہے کہ اس نے ان معلومات کو کسی طرح کہیں پر اپنے مستقبل کی خاطر محفوظ کی ہوں، جو اس کے ساتھ اچھے دنوں میں شیئر کی جاتی تھی، جس کو وہ اب مختلف دھمکیوں کی شکل میں گاہے بگاہے اپنی تقاریر کے دوران استعمال کرتا رہتا ہے۔ ورنہ ایسی کیا مجبوری ہو

سکتی ہے کہ جس انداز کی وہ دھمکیاں دیتے ہوئے بار بار ریڈ لائن کراس کر جاتا ہے تو کئی دنوں کی خاموشی کے بعد بڑی غور وخوض کر کے اس کی دھمکی پر "ناراضگی" کا اظہار کیا جاتا ہے۔

جان سنو، اگر نہیں جانتا تو جان لیں کہ پہلے اس کی معلومات ہر کسی کے دسترس میں تھیں اب معلومات اکٹھا کرنے والوں کا ڈیٹا بھی لونڈا بازار میں پڑا ہوا بک رہا ہے۔ جان سنو، تو پہلے بھی محفوظ نہیں تھا صرف اس کا اعتماد اسے سلائے ہوئے تھا لیکن اب تو جاگنے والوں کی عزت ساکھ اور کارکردگی بھی داؤ پر لگی ہوئی ہے، انفارمیشن کے تیز ترین ٹرانسمیشن کے موجودہ دور میں ہم اپنے بارے میں کتنا جانتے ہیں کہ کتنی حریم زادیاں اور سانتھیارچی کہاں تک لات مار کر ہمارے محفوظ دروازے کھول سکتی تھیں؟

بہتر ہزار مقتولین، دو پختون اور شرمندہ صحافت

سلیم صافی صحافت میں اپنا مقام رکھتا ہے، میں انہیں لڑکپن سے جانتا ہوں، جماعت، ایشیا پرنٹر، المورد اور این این آئی میں ان کی محنت کا میں گواہ ہوں، ہمارے پرانے دوست مشترکہ ہیں اور جب تک اس نے اپنے موبائل فون کے لئے سیکرٹری نہیں رکھا تھا، گاہے بگاہے ملاقات اور تبادلہ خیالا تبھی ہوتے رہتے تھے، میں سمجھتا ہوں کہ وہ سیلف میڈ انسان ہے، اگرچہ اکثر جاننے والے مجھ سے متفق نہیں۔

جرات سوال کا نعرہ لے کر سلیم صافی صحافی بنا تھا۔ شاید وہی جرات سوال کند پا کر احسان اللہ احسان اور راؤ انوار کے انٹرویو کے بعد ان کے زیادہ تر ہم قوم اسے اب گرے ایریا میں سمجھتے ہیں، لیکن یہ اس کی ڈیوٹی ہے کہ وہ سچ ظاہر کرنے کے لئے جس سے مناسب سمجھیں انٹرویو کرے، پھر وہ ایک ادارے کا نوکر بھی ہے، جو صحافتی اقدار کا خیال رکھے تو ادارہ بند ہو جانے کا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے اور اپنے صحافیوں کا خیال رکھے تو صحافت آئی سی یو میں چلی جاتی ہے ایسی حالت میں سروائیو کرنے کا فن صرف سلیم جانتا ہے۔

یہ اس کی محبت ہے کہ لاکھوں پسند کرنے والوں کے باوجود وہ صرف پختونوں کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کا خود کو ذمہ دار سمجھتا ہے، جس کا اظہار اس نے راؤ انوار کے انٹرویو سے قبل اور اب منظور پشتین کے انٹرویو کی صورت میں کفارے کی شکل میں کیا ہے۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ سلیم ہی احسان اللہ احسان اور راؤ انوار جیسے کرداروں کا انٹرویو

کیوں کرتا ہے جن کے ہاتھ پختونوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں؟ شاید اس لئے کہ اگر کوئی نان پختون ایسے کرداروں کا انٹرویو کرے تو اس پر پختون ردعمل بہت شدید آئے یا شاید اس لئے کہ اس پر متاثرین (پختون) یقین نہ کریں یا شاید اس لیے کہ ایسے خونی کرداروں کا ملائم چہرہ کسی پختون کے ذریعے پیش کرنا زیادہ مناسب سمجھا جاتا ہے اور یا شاید اس لئے، کہ یہ کردار جس علاقے کے لوگوں کے ساتھ ظلم و زیادتیوں میں ملوث ہیں وہ پختون ہیں اور ایک پختون کی حیثیت سے سلیم صافی ان حالات اور معاملات سے زیادہ باخبر ہے۔

وجوہات کچھ بھی ہوں سلیم نے پختونوں کے تسلیم شدہ قاتلوں کو قوم کے سامنے پرائم ٹائم میں بٹھا کر جرات سوال کا اظہار کیا نہ اپنے پینل میں متاثرین کا نمائندہ بٹھا کر صحافتی انصاف کیا۔ ورنہ وہ انوار سے پوچھ سکتا تھا کہ بقول آپ کے، نقیب اللہ دہشتگرد تھا، تو آرمی چیف نے اس کے والد کے ساتھ ملاقات کر کے اسے انصاف دلانے کا وعدہ کیوں کیا تھا؟ اس کے والد کا سرکاری خرچے پر سی ایم ایچ میں علاج کیوں کرایا تھا؟ اس کے والد کو سرکاری خرچے پر گھر بنا کر کیوں دیا؟ وہ دہشت گرد تھا تو کہیں چھپے رہنے کی بجائے سوشل میڈیا پر ڈیشنگ تصاویر اور دوستوں کے ساتھ ویڈیو چیٹ کر کے کیوں اپلوڈ کرتا رہتا؟ کراچی کی سڑکوں پر روایتی ناچ اتنڑ ناچ کر کیوں اپلوڈ کرتا رہتا؟ شاید اس نے اپنے نام کے ساتھ ساتھ پلاسٹک سرجری کے ذریعے چہرہ بھی تبدیل کر دیا تھا؟ پولیس افسران راؤ انوار کو کیوں بندے مارنے اور پلاٹ قبضہ کرنے کا حکم دیتے رہتے؟ کیا یہ راؤ انوار کی شہرت کی وجہ سے تھا یا پولیس میں یہ معمول کے واقعات ہیں؟ اگر وہ واقعی ایسا پولیس افسر ہے تو پھر وہ عدالتوں میں وی آئی پی گیٹ سے کیسے داخل ہوتا رہا اور قتل کے چار سو چوالیس الزامات میں کیوں اسے ایک دن ہتھکڑی لگی نہ جیل بھیجا گیا؟

پی ٹی ایم جبر کی پیداوار ہے جس کو جواں سال منظور پشتون نے اسلحہ زدہ علاقوں میں جنگ پسند قوتوں کے خلاف غیر مسلح شکل میں عزم اور مزاحمت کی طاقت سے لیس کر دیا ہے، جو اچھے اور برے سب جنگ پسندوں کے خلاف ہے۔ کیونکہ بروں نے ہمارے بہتر ہزار اپنے مارے ہیں اور اچھوں کی وجہ سے پوری قوم فیٹف کی چکی میں پس رہی ہے، جب کہ وہی

برے افغانستان میں اچھوں کے مہمان ہیں جن کی فتح کو ہم اپنی فتح سمجھتے ہیں اور جو ہمارے بروں کو ہمارے حوالے کرنے، ان کی حمایت سے ہاتھ اٹھانے یا کم از کم ان کو اپنے ملک سے نکالنے کی بجائے سرکاری تحفظ مہیا کر رہے ہیں۔

ان بہتر ہزار مقتولین میں صرف سترہ مقتولین غدار تھے کیونکہ ان کا تعلق علی وزیر کے گھرانے سے تھا، جس کو اس کے انہی جرائم میں پس زنداں ڈالا گیا ہے جو جرائم وکلا تنظیمیں، پی ٹی آئی، نون لیگ، ایم کیو ایم، جمعیت اور جماعت اسلامی کے کارکن اور رہنما کرتے رہتے ہیں، جس میں ایمان مزاری کو گرفتار کیے بغیر بری کیا جاتا ہے اور عمران خان اور اس کے حواریوں کو گرفتار کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا، اور پھر بھی ان سترہ کم بہتر ہزار مقتولین کے لئے انصاف یا خون بہا مانگنے کی بجٹ صرف آئین پاکستان کو ماننے کی شرط رکھی جائے اگرچہ ریاست کے پاس مقتولین کا خون بہانہ مانگنے یا قاتلوں کو معافی کا اختیار بھی نہیں۔

افغانستان میں تبدیل ہوتی ہوئی صورتحال اور بلوچستان کی حالت کو مدنظر رکھ کر بہترین سٹریٹیجی یہی ہے کہ اپنے خلاف اٹھنے والی بندوقیں جتنا ممکن ہو کم کر دی جائیں، کیونکہ افغانستان میں امریکہ کی دلچسپی کم ہوئی ہے نہ ختم ہو گئی ہے، طالبان کو حکومت سے نکال باہر کرنے کے علاوہ نان پختون اتحاد کے عزائم افغانستان کے جغرافیائی قطع برید پر بھی تیار ہے بشرطیکہ کہ ہمسایہ ممالک اور بڑے چوہدری ایسا کرنے میں پس و پیش سے کام نہ لیں، جس کے برے اثرات لامحالہ ازبکستان تاجکستان ترکمانستان ایران اور پاکستان کے علاوہ علاقائی سیاست پر بھی پڑیں گے۔

باخبر ذرائع کے مطابق حالیہ ٹارگٹ کلنگ اور فوج پر ہونے والے حملے طالبان نہیں بلکہ حافظ گل بہادر گروپ کر رہا ہے جو کبھی ہمارا لاڈلا تھا۔ حالیہ حملے جو بھی کرتا ہو اس سے علی الرغم، وزیرستان کی حالات پر گہری نظر رکھنے والے شفیق زمان وزیری کے مطابق شورش برپا کرنے کا طریقہ کار وہی ہے جو بائیس سال پہلے تھا۔ اس وقت بھی پہلے قبیلوں کے ان مشران اور عمائدین کو ٹارگٹ کیا گیا تھا جو مزاحمت کی طاقت اور حلقہ اثر رکھتے تھے، دوسری

لہر میں اس ظلم کو رپورٹ کرنے والے صحافی اور مخالفت میں آواز اٹھانے والے سوشل ورکرز، پختون نیشنلسٹ اور قومی واجتماعی سوچ رکھنے والے اساتذہ کو نشانہ بنایا گیا، جب یہ موثر آوازیں ختم کی گئیں تو پھر علانیہ جنگ کے ذریعے تمام قبیلوں کے زورآور خاندانوں کو دن دیہاڑے اس طرح نشانہ بنایا گیا کہ چھوٹے بچوں اور خواتین تک کو بھی نہیں بخشا گیا۔ چونکہ وزیرستان میں اسلام کے علاوہ کوئی مذہب اور دیوبندی کے علاوہ کوئی فرقہ موجود نہیں تھا اس لئے قتل وغارت کو جواز بخشنے کے لیے غدار اور ایجنٹ کی اصطلاحات گھڑی گئیں، جس کی وجہ جرگہ سلامت رہا نہ جنازہ، حجرہ سلامت رہا نہ بارات، مساجد بچیں نہ مزارات۔

ضرب عضب کے بعد لگتا تھا کہ ایک نئے دور کا آغاز ہوگا لیکن اب ایجنٹ اور غدار کی بجائے دہریہ، ملحد، ملعون یا ان کے آلہ کار کے الزام میں وہ لوگ ٹارگٹ کیے جارہے ہیں جو امن، علم، انسانی حقوق کے علمبردار، میڈیا ایکٹیوسٹ، سوشل ورکر اور سیاسی سرگرمیوں میں فعال ہوتے ہیں۔ فضل الرحمان گروپ کے علاوہ کے ہر کوئی نامعلوم قاتل کی زد پر ہے خواہ اس کا تعلق جماعت اسلامی سے ہو، یوتھ سے ہو، این ڈی ایم، پی ٹی ایم یا اے این پی سے۔ جمعیت اس لئے بچی ہوئی ہے کیونکہ ان کا بیانیہ اور سرگرمیاں وہی ہیں جو نشانچیوں کی ہے، یعنی رجعت پسندی، ازکاررفتہ نظام تعلیم اور علم، روشنی، روزگار، انسانی حقوق، قانون کی حکمرانی آئین اور پارلیمنٹ کی بالادستی اور ترقی سے گریزپائی، نور اسلام داوڑ، مصور داوڑ، سنید داوڑ وغیرہ کا امن، تعلیم، روزگار اور انسانی حقوق مانگنے کے علاوہ اور کوئی جرم نہیں تھا جن کو منہ پر ڈھاٹے باندھے ہاتھ میں قاضی نما بندوق پکڑنے والوں نے قتل کیا۔

سلیم صافی سے منظور پشتین کا یہ شکوہ بالکل برحق اور بجا ہے کہ آپ اپنے چینل پر پختونوں کے قاتلوں کو انٹرویو کا وقت دے سکتے ہیں لیکن انہی پختونوں کے لئے زندگی کا حق اور عزت کی زندگی امن روزگار تعلیم اور حقوق مانگنے والوں کو نہیں۔ جب کہ درحقیقت اس کا یہ شکوہ جس طرح سلیم صافی سے ہے اسی طرح یہ ساری شرمندہ صحافتی برادری سے بھی ہے۔ مذاکرات کرنے والوں کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ امن بیشک مذاکرات کے ذریعے آتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ مذاکرات کے لئے بیٹھنے والے اپنے مظالم پر شرمندہ ہوں

مظلوموں سے معافی مانگنے کے خواستگار ہوں اور بندوق رکھ کر آئندہ اچھے شہریوں کی طرح پاکستانی قانون اور آئین کے تحت زندگی گزارنے کا عزم کیے ہوئے ہوں۔

سوئٹزر لینڈ کی ایلزبتھ کا ایک پاکستانی مرد کے نام خط

ایلزبتھ اور میں چھ سال کے قریب ساتھ رہے، اس نے پشتو سیکھی تھی اور مسلمان ہو گئی تھی، لیکن اس سے بڑھ کر اس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ انسان دوست تھی، ایک سیال دل کی مالک، جو اکثر اس کی ہلکی نیلی آنکھوں سے بہہ نکلنے کو بیتاب ہوتا تھا۔ سوئٹزرلینڈ کے باشندے جمع تفریق کے ماہر سمجھے جاتے ہیں لیکن ایلزبتھ کو جمع کرنے کی بجائے تقسیم کرنا زیادہ اچھا لگتا تھا، وہ ایک شاندار انسان، خوبصورت عورت اور بہترین دوست تھی۔ برسوں پہلے یوم نسواں پر بھیجا ہوا اس کا ایک خط آپ کے ساتھ شیئر کرتا ہوں۔

"مجھے پتہ ہے، مرد ابھی آزاد نہیں ہوا خصوصاً آپ جیسا مرد، جو "خاندانی" ہو اور "اپنی ذاتی زندگی" کے بارے میں سوچنے کا بھی روادار نہ ہو۔ مرد آزاد ہوں گے یا نہیں، لیکن عورت آزاد ہو گی تو زندگی کی، محبت کی، تعلق کی، رشتوں کی خوشیاں سچی ہوں گی۔ وہ اپنی مرضی سے تیرے گلے میں بانہیں ڈالے گی، تو محبت کا امرت دھارا، روئیں روئیں سے تجھے اپنے وجود میں اترتا ہوا محسوس ہو گا، وہ اپنی مرضی سے تجھے چھوڑے گی تو نہ تجھے بے وفائی کا زخم لگے گا نہ دھوکہ ملنے کا درد ہو گا، وہ تیرے پاس واپس آئے گی تو تجھے احساس ہو گا کہ ساری دنیا کے سارے مرد چھوڑ کر تیرے پاس آئی ہے تو تم میں کوئی تو بات ہے اور تم اس کے ساتھ ساتھ اس کی پسند سے بھی پیار کرنے لگو گے، وہ آزاد ہو گی تو تیری پیٹھ پیچھے کسی اور کی بانہوں میں سکون نہیں ڈھونڈے گی، تجھے زہر دے کر مارے گی نہ کسی اور کے ساتھ مل

کر تیری لاش غائب کرے گی، وہ آزاد ہو گی تو کسی اور کے ساتھ نہیں بھاگے گی۔

وہ آزاد ہو گی تو تیری شاعری بے وفائی، ہر جائی پن، ہجر، فراق جیسے الفاظ سے خالی ہو جائے گی، تیرے بنائے ہوئے مجسموں میں حسن، وارفتگی، انبساط اور آسودگی کے رنگ نظر آنے لگیں گے، لیکن شرط یہ ہے کہ عورت آزاد ہو۔

آپ کو پتہ ہے آزادی دینے اور دلانے والا آزادی حاصل کرنے والے کا ہیرو ہوتا ہے، کیا آپ عورت کا ہیرو بننا چاہتے ہو؟ ہیرو بننا تو ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے اور تجھے تو ہیرو بننے کی شدید خواہش ہے، یہ جب آپ کسی عورت کی حمایت میں دفتر، بس اڈا اور بازار میں بولنے لگتے ہو، یہ ہیرو بننے کی خواہش نہیں تو کیا ہے؟ جب کبھی کوئی ناآسودہ کسی خاتون کو سرراہ چھیڑ لیتا ہے اور تم اس کے ساتھ الجھ پڑتے ہو تو یہ ہیرو بننے کی خواہش نہیں تو کیا ہے؟ جب سڑک کے کنارے کسی پریشان حال خاتون کو پنکچر گاڑی کے ساتھ کھڑی دیکھتے ہو اور اسے مدد کی پیشکش کرتے ہوئے ٹائر تبدیل کرنے لگ جاتے ہو تو یہ ہیرو بننے کی خواہش کے علاوہ کیا ہے؟ اگر تم ہیرو ہو تو یاد رکھنا، ہر ہیرو محبت کرتا ہے اور ولن نفرت اور زبردستی۔ مرضی آپ کی ہے، کہانی آپ کی ہے، کردار آپ کا ہے، ہیرو بننا چاہتے ہو یا ولن۔

آزادی چھیننے والا کبھی کسی غلام کا ہیرو نہیں بن سکتا، آزادی چھیننے والا غاصب اور ظالم کہلایا جاتا ہے، اس کے ساتھ بنایا گیا ہر رشتہ جھوٹ، فریب، دھوکہ، مجبوری، اور چاپلوسی پر مبنی ہوتا ہے، وہ، جس کو دھوکا، بے وفائی یا نمک حرامی سمجھتا ہے، وہ دھوکہ دہی، نمک حرامی یا بے وفائی نہیں ہوتی بلکہ اس کے ظلم اور جبر سے آزادی کی کوشش کا اظہار ہوتی ہے۔ ہر غلام کو غلامی سے آزاد ہونے کا حق ہوتا ہے اور غلام کا ہیرو اسے غلامی سے نجات دلانے والا ہوتا ہے۔

لیکن دوسروں کو آزادی دلانے کے لئے اپنی آزادی کا پہلے احساس ہونا چاہیے۔ کیا آپ کو احساس ہے کہ آپ آزاد ہو؟ اگر آپ کو اپنی آزادی کا احساس ہے، تو پھر اس آزادی کو استعمال کر کے اسے بھی آزاد کر دے، اسے بھی جینے کی، آزادی سے رہنے کی، اپنے فیصلے کرنے کی، اس کے فیصلوں کا احترام کرنے اور ان فیصلوں کو حقیقت کا روپ دینے میں ساتھ

دینے کی آزادی دے، اسے بھی تعلیم دلا دے، اسے بھی جائیداد میں اس کا حصہ دے، اس کی مرضی کا جیون ساتھی منتخب کرنے کا حق دے، اور اس کی مرضی نہ ہو تو اسے کسی کے ساتھ رہنے پر مجبور نہ کریں، ایک دفعہ کی زندگی ہے، آپ نے بھی جانا ہے، اسے بھی جانا ہے، آپ اس کے اعمال کے لئے جوابدہ نہیں، اس نے خود اپنا حساب دینا ہے اگر آپ کو یقین ہے کہ اللہ رحمن اور رحیم ہے تو وہ اس کے لئے بھی ہے، بس آپ رحم کریں۔

آپ اپنی مرضی، اپنی عزت، اپنی ضد، اپنی انا، اپنی جائیداد، اپنی جہالت کی خاطر اسے ماریں نا، اس کا ساتھ دیں۔ باپ بیٹا شوہر اور بھائی بننے کی بجائے اس کا ہیرو بنیں، پھر زندگی کا لطف دیکھیں۔ لیکن تم ڈرتے ہو کہ تمہارے بنائے ہوئے قوانین، ضوابط اور رسم و رواج کی رسی کھل جائے گی، تو وہ تجھے چھوڑ دے گی اور تم اکیلے رہ جاؤ گے، اور اگر وہ ساتھ رہے گی بھی تو اپنے شرائط اور اپنی مرضی سے رہے گی۔ تم ڈرتے ہو کہ وہ تمہیں چیلنج کرے گی، تیری منطق کو وہ رد کرے گی اور پوچھے گی کہ جب تم محبت کرتے ہو تو ہیرو ہوتے ہو لیکن وہ محبت کرتی ہے تو ولن بن کر قتل کیسے ہو جاتی ہے؟ اور ہاں تم عورت کے جسم سے بھی ڈرتے ہو، اس لئے جب وہ کہتی ہے میرا جسم میری مرضی، تو تم کانپ کر اول فول بکنے لگتے ہو، اس پر تھوکنا چاہتے ہو یا اس پر تیزاب پھینک دیتے ہو۔ عورت کا جسم ہے ہی ایسا، کہ مرد کبھی اسے برقعہ پہنا کر چھپاتا ہے اور کبھی خود چادر میں منہ لپیٹ کر اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ نہیں سکتا۔ جب تم محض اس کے جسم کا سامنا نہیں کر سکتے تو اس کو علم اور ہنر دلا کر آزادی دی تو پھر کیا کرو گے؟ پھر ابھی تم نے عورت کے وجود کو پورا دیکھا کہاں ہے؟ تمہیں تو اس کے وجود کے بس وہی حصے نظر آتے ہیں جو تمہارے جیسے نہیں ہیں، تم نے کبھی سوچا ہے کہ عورت ایک مکمل انسان ہے، جس کے جسم کے اندر ایک دھڑکتا ہوا خواہشات بھرا دل ہوتا ہے، دماغ ہوتا ہے، جو سوچتا ہے، چاہتا ہے، سمجھتا ہے، لیکن تم اس کے آدھے جسم سے نظر ہٹاؤ گے تو پوری عورت نظر آئے گی۔

لیکن جب زندگی کے کھیل کے قوانین اور شرائط تم بناتے ہو، جب ہر قانون اسے ہرانے اور اپنے مفادات کے لیے ترتیب دیتے ہو، جب میدان بھی تمہارا ہو، تماشائی بھی

تمہارے ساتھ ہوں، امپائر بھی تمہارا حامی ہو تو پھر زندگی اسی طرح بے رنگ، یک طرفہ اور بد ذائقہ ہو گی، زندگی کشاکش بھرا امیدان ہو گی، بے اعتمادی اور بے اطمینانی بھرا، اور یہ سب نہ بھی ہو تو محبت نہیں ہو گی جبکہ محبت آکسیجن کی طرح زندگی کے لئے اہم ہے۔ محبت اور مجبوری میں ایک میم کے سوا کوئی مشابہت نہیں۔

کروناوائرس، صارفین اور منافع کا دیوتا

جب تک ذرائع ابلاغ ایجاد نہیں ہوئے تھے ضرورت ایجاد کی ماں تھی لیکن اب پہلے مصنوعات ایجاد کیے جاتے ہیں اور بعد میں پروپیگنڈے کے زور پر ضرورت بنا کر بیچے جاتے ہیں۔

عقلمند ہونے کی بنا پر ڈر اور لالچ انسان پر اثر انداز ہونے والے دو بڑے محرکات ہیں، جن کے سبب انسان کو کچھ بھی کرنے پر تیار اور آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ ایڈورٹائزنگ کے گرو انہی دو محرکات کو بروئے کار لا کر سالانہ اربوں کھربوں کے کاروباری سودے کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ خوبصورتی، کامیابی، صحت مندی، لمبی اور آرام دہ زندگی، پائیداری، بچت، تحفظ، شہرت، امتیازی معاشی اور معاشرتی حیثیت اور نہ جانے کون کون سے خوابوں کے لالچ دلا کر اور بدصورتی، ناکامی، بیماری، معذوری، ناپائیداری، تہی دستی، عدم تحفظ اور معاشی نارسائی کا خوف اور احساس کمتری جگا کر کیا کچھ نہیں بیچا جاتا؟

کھیتوں میں پلنے اور قدرتی چراگاہوں میں چرنے والے مویشیوں کے تازہ دودھ سے ڈرا کر کیمیکل اور ملاوٹوں بھرا باسی دودھ، کارخانہ دار اپنے سرمایہ کے زور پر بیچتا ہے، گھروں میں پکی تازی روٹی کی بجائے پروپیگنڈے کے دم پر ہم باسی روٹی (ڈبل روٹی، بریڈ، کیک اور بسکٹ) کھانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ دودھ لسی جیسی صحت بخش خوراکیں چھوڑ کر چائے، کافی اور کولڈ ڈرنکس پینے کو بہتر سمجھتے ہیں۔، جان بچانے والی ناگزیر دوائی کی طرح، جو تریاق ہونے

کے ساتھ ساتھ کچھ سائڈ افیکٹ کی بھی حامل ہو، سگریٹ جیسے زہر اور قاتل پر بھی صرف مضر صحت لکھ کر بیچا جا سکتا ہے تو پھر سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا؟ عام صارف کے لئے جاننا ناممکن ہے۔ بناسپتی گھی کی مارکیٹنگ کے دوران دیسی گھی کو صحت کا دشمن باور کرایا گیا تو کارخانے چلے لیکن اب بھی کامیاب اتھلیٹ اور کھلاڑی دیسی گھی کو جزو خوراک بنانے کی تصدیق کرتے ہیں۔

برڈ فلو حقیقی بیماری ہے لیکن پولٹری فارمنگ کی صنعت کو دیسی مرغیوں کی مارکیٹ میں مقبولیت کی صورت میں مسابقت کا سامنا تھا، سیل بڑھانی تھی، مارکیٹ میں سپلائی، قلت اور قیمت پر اجارہ داری قائم کرنی تھی تو ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے برڈ فلو کو خوفناک بلا بنا کر پیش کیا گیا تاکہ گھروں میں موجود مرغیوں کی نسل کشی ممکن ہو سکے۔ اس کیلئے چند میڈیا مالکان، اینکرز، صحافیوں اور کالم نگاروں کی ضروریات کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔

اگر میڈیسن کا کاروبار، بیماریوں اور ڈاکٹروں کی روزی بیماروں سے وابستہ ہے تو لامحالہ دونوں کو مارکیٹ اور صارفین کی ضرورت پڑتی ہوگی، دونوں کا منافع جراثیم اور بیماریوں کی مرہون منت ہے، اگر ساری بیماریاں اور مضر صحت جراثیم ختم کر دیئے جائیں تو صنعتکار اور ڈاکٹر کیا چھولے بیچیں گے؟ وباؤں کے موسم میں میڈیسن کمپنیاں اپنی مصنوعات ڈاکٹروں کے ذریعے صارفین کو بیچتی ہیں لیکن وبائیں نہ ہونے کی صورت میں وہ بھی دوسرے صنعت کاروں کی طرح مندی سے ڈرتی ہیں۔

اخبار میں سروے چھپ جاتا ہے کہ فلاں شہر کا پانی ہیپاٹائٹس اور ٹائفائیڈ کی آماجگاہ ہے، شہر کے دو چار بڑے ڈاکٹر مخصوص لیبارٹریوں میں اپنے مریض ٹیسٹ کروانے بھیجنا شروع کر دیتے ہیں اور اخباری رپورٹ کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ "کامیاب علاج" کے بعد دوبارہ اسی لیبارٹری سے ٹیسٹ کروا کر صحت مند قرار دیے جانے والے مریض جب اپنے گھر میں جشن صحت مناتے ہیں تو ان کا "علاج" کرنے والے ڈاکٹر اور لیبارٹری کے مالک میڈیسن کمپنی کی تعاون سے اپنے بچوں سمیت آسٹریا یا سوئٹزرلینڈ میں زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں۔

سرمایہ اور صارف کے درمیان مسیحا اور کوڑھی کا نہیں منافع کا یک طرفہ رشتہ ہوتا ہے۔ماضی میں غربت، بڑی آبادی اور اس آبادی کے لئے ناکافی خوراک کی وجہ سے چینی آج بھی "غیر روایتی پکوانوں" کے لئے مشہور ہیں اس لئے شہر شہر سبزی مارکیٹوں کے ساتھ ساتھ وہاں "چڑیاگھر" بھی موجود ہیں، کرونا کہاں سے آیا کوئی یقینی وجہ معلوم نہیں، لیکن بڑی آبادی کا مطلب بڑی بھیڑ، بڑی بھیڑ کا مطلب آپس میں زیادہ رابطہ اور تعلق، زیادہ رابطے کا مطلب جراثیم کا زیادہ اور تیزی سے پھیلاؤ، زیادہ پھیلاؤ، زیادہ بیمار، زیادہ بیمار، زیادہ صارفین، زیادہ صارفین تو زیادہ منافع، اور منافع سرمائے کا دیوتا ہے۔

چین صنعتی ملک ہے، پیداوار، ٹارگٹس اور مارکیٹ کو چھوڑیں، ایک ارب سے زیادہ چینیوں کے لئے کتنے ماسک، گلوز اور سرنجوں کی ضرورت ہے؟ منافع کے مندر میں سرمایہ بسجود ہے۔ ضروری نہیں کہ کروناوائرس واقعی اتنا مہلک ہو کہ چینی آبادی میں کوئی نتیجہ خیز تبدیلی لاسکے، میڈیا کے ذریعے کرونا کا ہوا بنا کر اس سے زیادہ کمایا گیا جتنا ٹویوٹا کمپنی کسی وقت میں کرونا ماڈل کی کار بیچ کر کماتی تھی۔ ایک اور خوفناک حقیقت بھی آشکارہ ہوئی کہ ایٹم بم، سٹیلتھ طیارے، سپر سانک کروز میزائل، کیل کانٹے سے لیس جدید خونخوار افواج، عجائب گھر میں سجانے کی چیز بن جاتی ہے اگر کسی ملک کے پانی یا خوراک کے ذخیروں میں کوئی نادیدہ ہاتھ کوئی مہلک جراثیم چھوڑ جائے۔

انڈیا میں چھوٹے قد کے ایک بڑے اداکار کے سامنے ایک صنعتکار نے بلینک چیک رکھ کر اپنے نئے بیگ کے اشتہار میں کام کرنے کے لئے آمادہ کرنا چاہا، اداکار موڈی تھا انکار کر دیا تو صنعتکار اس پروڈیوسر کے گھر چلا گیا جو انکار کرنے والے اداکار کی آنے والی فلم پر سرمایہ کاری کر رہا تھا۔ صنعتکار نے بغیر کسی صلے کے اس کی فلم کے آدھے اخراجات بھرنے کی حامی بھر لی شرط صرف یہ تھی کہ پروڈیوسر پوری فلم میں اداکار کو اس کا دیا ہوا لمبی پٹی کا بیگ پہنا دے۔ فلم ہٹ ہوئی، صنعتکار نے کوئی اشتہار دیے بغیر اپنے کروڑوں بیگ بیچ کر فلم پروڈیوسر سے زیادہ کمائے۔ سرمایہ مسجد بنائے، مندر بنائے یا گرجا گھر، غریبی وہاں عبادت نہیں کرتی اس کے باہر چادر پھیلا کر بھیک مانگتی ہے۔

سیلیکٹرز کا سیاستدان

عمران خان ایک کھلاڑی تھا باقی اچھے کھلاڑیوں کی طرح۔ آپ اپنے محلے، علاقے، کلب یا ارد گرد نظریں دوڑائیں گے تو آپ دیکھ لیں گے کہ ایک کھلاڑی کو کھیلنے کے علاوہ پڑھائی لکھائی اور دوسری معاشرتی سرگرمیوں میں کتنی دلچسپی ہوتی ہے؟ پڑھائی لکھائی نہ کرنا تو کھلاڑی کے لئے اپنے بزرگوں اور اساتذہ کی طرف سے سب سے بڑا طعنہ اور تنبیہہ ہوتی ہے، ہر کوئی اسے سمجھاتا رہتا ہے کہ تم سارا دن کھیلتے ہو پڑھائی پر کوئی توجہ نہیں دیتے جبکہ دوسرے سارا دن پڑھتے ہیں۔ پڑھائی نہ کرنا جتنا برا عمل سمجھا جاتا ہے کھیل کھیلنا بھی اتنا ہی برا سمجھا جاتا ہے۔

دوسرا گیند کے خالق ثقلین مشتاق، ایک ملاقات کے دوران بتا رہے تھے کہ جب سے مجھے کرکٹ کھیلنے کا جنون ہوا اس دن سے لے کر پاکستان کرکٹ ٹیم میں سیلیکٹ ہونے تک میں دن رات ٹریک سوٹ پہن کر جیتا، جاگتا اور سوتا رہا۔ میں ماموں، تایا، چاچی، نانا اور دوسرے بہت قریبی رشتے داروں کے جنازوں میں ٹریک سوٹ پہن کر چند لمحوں کے لئے شریک ہوا، اپنے بڑے بھائی کی برات میں نہیں گیا کیونکہ میرے کلب کا اس دن میچ تھا، برات واپسی پر گراؤنڈ کے قریب آ کر رکی اور میرے لئے بینڈ بجائی، کالج امتحان سے ایک مہینے پہلے جاتا، پڑھائی میں اچھا نہیں تھا بس پاس ہو جایا کرتا تھا۔ یہی حالت ہر اچھے کھلاڑی کی ہوتی ہے اور وہ بھی ایک اچھا کھلاڑی تھا۔

جب دوسرے بچے کیمسٹری کے فارمولے اور فزکس کے کلیے رٹتے ہیں، کھلاڑی کھیلتا ہے، جب دوسرے ریاضی کی مہارتیں سیکھتے ہیں، کھلاڑی کھیلتا ہے، جب دوسرے تاریخی واقعات، فیصلہ کن جنگوں، قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کے بارے میں جانتے ہیں، کھلاڑی کھیلتا ہے۔ جب باقی لوگ قرآن و سنت، حدیث و فقہ میں درک حاصل کرتے ہیں، کھلاڑی کھیلتا ہے، جب دوسرے سیاست، الیکشن، پارٹی، معاشرتی، ملکی اور غیر ملکی مسائل پر بحث و مباحثہ اور غور و فکر کرتے ہیں، کھلاڑی کھیلتا ہے، جب دوسرے گلی گلی احتجاج، زندہ باد مردہ باد، انقلاب، حقوق اور ان کی پامالی کے خلاف میدان میں ہوتے ہیں، کھلاڑی میدان میں کھیلتا ہے۔ جب چھٹی کے دن، دوسرے، دوستوں کے ساتھ، جوش و جذبے سے بھرپور ایک دن گزارنے، کوئی میچ دیکھنے سٹیڈیم جاتے ہیں، کھلاڑی کھیلتا ہے۔

کھلاڑی کو بس ایک خواہش ہوتی ہے یعنی کھیلنا اور بہترین پرفارمینس دینا، مخالف کو مٹی چٹانا، ہزاروں لوگوں کے درمیان، ان کی تالیوں کی گونج اور کیمروں کی چکاچوند میں، اپنا جیتا ہوا کپ اٹھا کر فخر و انبساط سے دکھانا اور یہی اس کی زندگی کا معراج سمجھا جاتا ہے۔ اس کے لئے کھیل سے بڑھ کر کوئی کام اور جیت سے بڑھ کر کوئی خواہش نہیں ہوتی۔

اب اگر وہ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی اور جاپان کو لڑاتا ہے اور جنگ کے بعد ان کے مشترکہ بارڈر پر مشترکہ صنعتی شہر بساتا ہے، بابائے قوم کو کینسر کا مریض بتاتا ہے تو بات یہ ہے کہ انہوں نے عالمی تاریخ، جغرافیہ اور سیاست نہیں پڑھی نہ کوئی دلچسپی رہی کیونکہ وہ کھیلتا تھا۔ اگر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے بارے میں غیر محتاط یا نامناسب الفاظ استعمال کرتا ہے تو وہ اس لئے کہ وہ ان کے بارے میں عقیدت اور عزت سے بات کرنے والوں کی محفلوں میں زیادہ نہیں بیٹھا۔ وہ دل کا برا نہیں، بس یہ سب سیکھنے کی بجائے وہ کھیلتا تھا۔

وہ ایک کھلاڑی تھا اپنے کھیل کے ساتھ مخلص کھلاڑی، جس کی ساری توجہ اپنے جسمانی تیاری اور فٹنس پر رہی اور آج تک ہے، اس نے عقل، شعور، دماغ، اگر استعمال کیا تو کھیل کھیلنے اور کھیل جیتنے کے لئے۔ اسے اچھی انگریزی آتی ہے تو اس لئے کہ وہ نوجوانی میں

انگلینڈ میں کھیلنے گیا تھا، وہاں کی یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو ذہنی استعداد یا کسی عقلی معیار کی بنا پر نہیں بلکہ کھیل کی بنیاد پر، کیونکہ وہ کھیلتا تھا۔

آج تک اس نے کسی تقریر، بحث یا مذاکرے میں علم یا کتاب کی بات نہیں کی، صرف خواب بیچے ہیں۔ کبھی نہیں بتا سکا کہ ایک کروڑ گھر اور پچاس لاکھ نوکریاں کیسے دے گا؟ کبھی معاشی، معاشرتی، بین الاقوامی امور یا اقتصادیات پر کوئی قابل توجہ بات نہیں کی۔ پہلے دنیا جہاں کی ساری برائیاں نواز شریف میں تھیں اب مودی میں ہیں۔ وہ ہر موقع پر صرف کرکٹ کا ذکر کرتا ہے۔ امپائر، وکٹ، فیلڈنگ، باؤنسر، ورلڈ کپ، ٹورنامنٹ، بس یہی اس کا ذخیرہ الفاظ ہے کیونکہ وہ کھیلتا تھا۔

ستر سال کی عمر میں خود کو کپتان کہتا، کہلواتا اور خوش ہوتا ہے۔ اپنے وزراء، امراء اور قریبی پارٹی ممبران کو پرانے، بوڑھے، ریٹائرڈ کھلاڑیوں کے نام دیتا ہے۔ جوانی میں لمبے بالوں کا جو سٹائل اپنایا تھا آج تک چند بالوں کی کمی کے ساتھ وہی سٹائل، وہی لمبے کالے بال۔ (ذمہ داری سنبھالنے کے بعد امریکی صدور کے بال چند سالوں میں چٹے سفید ہو جاتے ہیں۔) وہ کرکٹ کے کھیل اور سٹیڈیم سے ذہنی طور پر نکلا ہی نہیں بھلے وہ ستائیس سال پہلے ریٹائرڈ کیوں نہ ہوا ہو۔

حالیہ امریکی دورے کے دوران فارن افیئرز ریلیشنز کمیٹی کے سامنے اور صدر ٹرمپ کے ساتھ مشترکہ پریس سیشن میں، جب اس نے گرم توے پر بیٹھنے کا بے بسی سے بھرپور اور مایوسانہ ذکر کرنے کے ساتھ اپنے شاندار ماضی میں غوطہ مار کر نوے ہزار تماشائیوں کے درمیان پریشر میں کھیلنے کا ذکر چھیڑا تو ان کے ساتھ ہمدردی محسوس کرنے کے باوجود اپنے بال نوچنے چاہے۔ ٹھیک ہے کہ وہ کھیلتا تھا لیکن آج اس کی گزری ہوئی کہانیاں کوئی سننا نہیں چاہتا، کوئی تو اسے سمجھائے کہ آپ گیارہ کھلاڑیون کے کپتان نہیں بائیس کروڑ لوگوں کے وزیراعظم ہیں۔

وہ کھلاڑی تھا اور کھیل کی سیاست سے باہر اسے سیاست کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ سیاست کو گند سمجھتا تھا، بے نظیر بھٹو کے دور میں اس نے ایک اخباری نمائندے کے،

سیاست میں آنے کے بارے میں پوچھے گئے سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ میں پاگل ہوں کہ سیاست میں آؤں اور لوگوں کی نفرتوں کا شکار بنوں، تجھے اچھا نہیں لگتا کہ سب میری عزت کرتے ہیں، مجھ سے محبت کرتے ہیں۔

وہ کھلاڑی تھا لیکن چند موقع پرست جرنیلوں اور خرانٹ کالم نگاروں نے اسے خود اس کو سیاستدان باور کرایا۔ انسان دشمن سیلاب سونامی کو اس سے تشبیہہ دی، مشہور زمانہ اینیمیٹڈ فلم لائن کنگ کے چوری کردہ مکالمے، اب نہیں تو کب، اور تم نہیں تو کون، ازبر کروائے (مجھے یقین ہے وہ نہیں جانتا کہ جس دانشور نے اپنے جملے کہہ کر ان کو یہ نعرے دیے وہ بچوں کے کارٹونوں سے سرقہ کرتا ہوگا)، ایاک نعبدو وایک نستعین، جیسے سیاق وسباق سے الگ اور ادھوری آیات کریمہ ان کی زبان پر چڑھائیں۔ روحانیت جیسا زبان زد عام لفظ بمشکل ادا کرنے والے کو ریاست مدینہ کا خلیفہ مشہور کرایا جبکہ مدینے والے صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد کوئی ریاست بنانا نہیں تھا، ریاست تو انہیں پیغمبری کے صدقے میں ملی تھی۔ عمران کی مدینے والے سے عقیدت کی حالت یہ ہے کہ مدینے سے پلٹ آنے کے بعد بھی دوسرے چوکھٹوں کو چومتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔

کبھی جوتے اتار کر مدینے کی گلیوں میں نیاز مندی کا اظہار کرتے ہیں تو کبھی فوجی دستوں کے درمیان خانہ خدا اور خانہ پیغمبر میں جوتوں سمیت جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اتنے سارے سرکاری عمرے کرنے کے باوجود آج تک مدینے والے کی محبت میں، ان کے بال کٹے ہوئے دیکھے نہ کبھی اپنے بچوں کو مدینے والے کی چوکھٹ پر قدم بوسی کے لئے لے گئے جبکہ ہماشما کو جہازوں میں بھر بھر کر لے جاتے ہیں۔

اگر آپ کو ایک مدبر، سیاستدان ایک ماہر اقتصادیات اور عالمی امور کا ماہر، ایک تاریخ دان اور عالم، عربی زبان، صرف و نحو اور لحن داؤدی میں ید طولیٰ رکھنے والے قرآن وفقہ، قانون و معاشرت پر عبور رکھنے والے رہبر و رہنما چاہیے تھا تو آپ نے ایک کھلاڑی کو کیوں منتخب کیا؟ اگر آپ کو اپنے وزیراعظم کے منہ سے ریلو کٹے جیسے روزمرہ کے الفاظ اور تو تڑاخ والی عوامی زبان اچھی نہیں لگتی تو غلطی آپ کی ہے، چند مستثنیات چھوڑ کر سارے

کھلاڑی اسی عوامی زبان میں بات کرتے ہیں۔

کھلاڑیوں میں خال خال لکھے پڑھے ملتے ہیں، اگر آپ کے ذہن میں چند متشرع کھلاڑی اٹکھیلیاں کرنے لگے ہیں تو ان کو بھی ساتواں نمبر یاد نہیں ہے، وہ کھیل کا ماہر ہے اور ریٹائرڈ ہونے کے بعد ٹیم مینیجر، کوچ، کمینٹیٹرز، اور زیادہ سے زیادہ بورڈ کا چیئرمین بن سکتا ہے وہ کسی سیاسی پارٹی کا ممبر بنا نہ ورکر، کسی سیاست دان کے سیکرٹری رہا نہ دست راست، احتجاج میں حصہ لیا نہ جلسے جلوس میں، پارلیمانی کمیٹی کا رکن بنا نہ چئیرمین، وزیر بنا نہ وزیر اعلیٰ اور سیاست کرتا ہے۔ جب ممبر قومی اسمبلی منتخب ہوا تو اسمبلی میں آنے، سیاست سیکھنے، مسائل اور ان کا حل جاننے، صورت حال اور تنقید برداشت کرنے کی بجائے اسمبلی پر لعنت بھیجتا رہا۔ آپ نے خود ایک کھلاڑی کو وزیر اعظم بنایا اور اب سیاست میں معجزات کی توقع کرتے ہیں۔ کیا آپ زرداری یا نواز شریف کو کرکٹ ٹیم کا کپتان بنانے کے بعد کسی معجزے کی توقع کرسکتے ہیں؟ آپ نے سیاست جیسے قابل ترین دماغوں کے لئے بنے مقدس ترین فن کو، جو قوموں کی زندگی بنا بھی سکتا ہے اور بگاڑ بھی سکتا ہے، جس کو آپ کے ہاں جھوٹ، منافقت، بیان بازی اور موقع پرستی سمجھا جاتا ہے، ایک کھلاڑی کے حوالے کیا اور اب کھیل سے زیادہ کسی نتیجے کی توقع رکھتے ہیں؟

سیاست ڈھائی ہزار سالہ انسانی تجربات کا نچوڑ ہے۔ یہ چرچل، لائیڈ، ڈزرائیلی، ابراہم لنکن، جناح، گاندھی، نیلسن منڈیلا، اور باچا خان جیسے نابغہ روزگار شخصیات کا میدان ہے، جس قوم کی مت ماری جاتی ہے وہ سیاست کو ناچ گانا، شور شرابا، پھکڑپن، گالم گلوچ اور جھوٹ سمجھتی ہے۔

اشرف غنی واپس آنے والا ہے

ہندوستان سے جاتے جاتے برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ انڈیا کو تقسیم کرکے آزاد کرنے کے لئے شاہی خاندان کے کسی فرد کو ہندوستان جانا چاہیے تاکہ وہاں سے اپنی روانگی اور ہندوستان کی تقسیم کو ایک یادگار تاریخی واقعے کی شکل دلائی جاسکے، اس لیے اس نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان بھیج دیا۔ سکھوں کی برطانیہ کے لئے بیشمار خدمات تھیں جنہوں نے پنجاب کی تقسیم کو اپنے ساتھ احسان فراموشی سمجھ کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور برطانیہ کو جواب میں فسادات کا تحفہ دے کر ہمیشہ کے لئے شرمندہ کیا۔

بعینہٖ یہی سلوک عمران خان اور اس کے ساتھی جرنیل نے افغانستان سے نکلنے والے امریکہ کے ساتھ کیا، جس نے دوحہ معاہدے کے ذریعے افغانستان کے تمام فریقین کو باہمی رضامندی سے ہمہ شمول عبوری حکومت بنانے اور پھر انتخابات کروانے پر تیار کرنے کے انتظامات مکمل کر لیے تھے، لیکن عین آخری وقت پر معاہدے سے ماوراطالبان کے ایک گروہ کی اچانک کابل آمد اور اس کے رد عمل میں اشرف غنی کا ملک چھوڑنے کے فیصلے نے برسوں پر مشتمل ان کے کیے گئے مذاکرات اور معاہدات پر پانی پھیر دیا۔

یوں اس معاہدے پر دوبارہ عملدرآمد کرانے اور باہمی اعتماد قائم کرنے میں پورا امریکہ کا ایک سال صرف ہوا۔ ایک طرف افغانستان کے اثاثے منجمد ہوئے اور افغان عوام کو مصائب کا سامنا کرنا پڑا تو دوسری طرف پاکستان کی اقتصادی حالت ابتر ہوگئی۔ لیکن بڑے

امتحان سے جنرل باجوہ اور ان کے قریبی رفقاء کو گزرنا پڑا، جو خلوص نیت کے ساتھ دوحہ معاہدے پر عملدرآمد کرانا چاہتے تھے، تاکہ افغانستان میں امن اور پاکستان میں اقتصادی استحکام کے ساتھ ساتھ پاکستان اس معاہدے کی ناکامی سے گرنے والے نزلے سے بچ جائے، کیونکہ کابل سیرینا میں قہوے کے ایک کپ نے پاکستان کی پوزیشن پارٹ آف دی سلوشن ہونے کی بجائے پارٹ آف دی پرابلم بنادی تھی۔ پاکستان کو بین الاقوامی برادری میں دوبارہ قابل اعتماد مقام دلانے کے لئے جنرل باجوہ نے ڈٹ کر اپنے خلاف کیے گئے ہر قسم کے کریکٹر اسیسینیشن اور بدترین پروپیگنڈا کے باوجود دوحہ معاہدے کو کامیاب بنانے کی اپنی کوششیں جاری رکھیں۔

دوحہ معاہدے کے مطابق طالبان دوسرے افغان گروہوں کے ساتھ مل کر عبوری حکومت بناتے، جو آگے جاکر انتخابات منعقد کرتی اور اس کے نتیجے میں بننے والی حکومت افغانستان کی بھاگ دوڑ سنبھالتی، نتیجتاً امریکہ کی افغان حکومت کے ساتھ دوسرے ممالک کی طرح دوستانہ تعلقات ہوتے، کیونکہ اس نے اس خطے میں اپنے مفادات کی تحفظ کے لئے عشروں تک اپنا خون پسینہ اور ڈالر ایک ساتھ بہائے تھے، جہاں سے وہ اپنی موجودگی کے ذریعے روس کو یورپ میں اور چین کو ایشیاء میں اپنی من مانیاں کرنے سے روک سکتا، ایران پر نظر رکھ سکتا، ہندوستان کو پاکستان کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنے پر مجبور کر سکتا، افغانستان کو دہشت گردوں کی جنت سے افغانوں کی جنت میں تبدیل کر سکتا، جہاں وہ دنیا جہان سے بلاخوف و خطر واپس آکر نئی دنیا میں سیکھے ہوئے علوم اور کمائے ہوئے سرمایہ سے دوبارہ اپنا گھر بناتے، لیکن کابل سیرینا میں قہوہ پینے کی ہماری تصویر نے یہ سب کچھ نہیں کرنے دیا۔

دوحہ معاہدے سے بالاتر کچھ گروہوں کی کابل میں اچانک آمد نے کسی بڑے سانحے کو تخلیق کرنے کے اشارے دیے، اس لیے اشرف غنی کو سردار داؤد اور ڈاکٹر نجیب بننے سے بچانے کے لئے ایمرجنسی میں افغانستان سے نکالا گیا، جنگی جہازوں، ہیلی کاپٹروں، پائلٹوں اور ہزاروں افغان فوجیوں کو تاجکستان قطر یورپ اور کینیڈا پہنچایا گیا جبکہ امریکی فوجی پاکستان

لائے گئے۔ معاہدے کی خلاف ورزی کی پاداش میں طالبان حکومت کو عالمی پذیرائی ملی نہ افغان ریاست کے بین الاقوامی بینکوں میں پڑے ہوئے اپنے اثاثے اور نہ بین الاقوامی امداد۔ جس پر انہوں نے اقلیتوں اور عورتوں کے حقوق غصب کرنے کے علاوہ بچیوں کے تعلیمی اداروں پر پابندی لگا کر عالمی ضمیر کو اپنی امداد کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی، لیکن ناکام ہوئے۔ پاکستان میں ان کو سمجھانے اور چلانے والے بے اثر کر دیے گئے، (پاکستان میں حالیہ اتھل پتھل، عمران خان کا آخری یوٹرن جنرل فیض کی ریٹائرمنٹ اور بڑے عہدیداروں کی ری سٹرکچرنگ مد نظر رہے) تو آخر کار افغان دانش چھا گئی، جس نے ہمیشہ مشکل مراحل میں اپنی قوم کی رہنمائی کر کے اسے مسائل سے باہر نکالا ہے، اس لیے سر دیاں چھانے کے باوجود افغانستان میں بہار آنا چاہتی ہے، اور یہ بہار پاکستان کی طرف سے آئے گی۔

ایبسولوٹلی ناٹ کا مطلب افغانستان میں تاریکیوں کی راج کا دوام، رجیم چینج کا مطلب دوحہ معاہدے پر عملدرآمد کے لئے سازگار ماحول بنانا اور وہاں جمہوریت کی آمد، امریکی سازش کا مطلب عمران خان اینڈ کمپنی کی افغانستان میں منفی دخل اندازی کا خاتمہ اور آخری یوٹرن کا مطلب ان سب قوتوں کی ناکامی اور مایوسی کا اعلان ہے جو افغانستان میں امن کے خلاف کوشاں تھیں، اور جن کے خلاف جنرل باجوہ اپنی ٹیم کے ساتھ چھ مہینے سے چومکھی کی جنگ لڑ کر سرخرو ہوئے ہیں۔

پس منظر میں رہنے والوں کے علاوہ اپنی سیاسی دانش اور مذاکرات کاری کی مہارت سے دوحہ معاہدے کو دوبارہ زندہ کرنے اور طرفین کے درمیان باہمی اعتماد سازی کرنے والے محسن داوڑ کا ذکر ضروری ہے۔ منظور پشتون اور علی وزیر کے ساتھی محسن داوڑ کو بوجوہ وہ میڈیائی توجہ نہ مل سکی جن کے وہ جائز حقدار ہیں۔ جنرل باجوہ کی طرح محسن داوڑ بھی اپنوں کی نظر میں مطعون ٹھہرے لیکن قائمہ کمیٹی برائے خارجہ امور کے چیئرمین بننے کے ذریعے انہیں جو آسمان مہیا کیا گیا تھا انہوں نے اس کا خوب استعمال کیا۔

اہم ممالک کے سفراء سے ملاقاتیں ہوں، طرفین کے درمیان پیغام رسانی اور مفاہمت کاری ہو یا ملک ملک جا کر مختلف افغان گروہوں کے ساتھ گفت و شنید اور گھنٹوں پر

محیط نازک سفارتی معاملات، غرض یہ کہ افغان امن خوشی خوشحالی اور پختونوں کے روشن مستقبل کے لئے محسن داوڑنے ہر فیلڈ میں اپنی صلاحیتوں کو ثابت کیا، جس کا مثبت نتیجہ جلد سب افغان دوست امن پرور جمہوریت پسند اور روشن فکر اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے ہیں۔ یورپ میں باقی افغان مزاحمت کاروں اور گلف میں اشرف غنی سے ملاقاتیں اس سلسلے کی ایک اہم کڑی تھی۔

قومی علاقائی اور بین الاقوامی سٹیک ہولڈرز اور ضامن افغانستان میں امن خوشحالی جمہوریت اور ترقی کی خاطر اپنی تیاریوں کو آخری بار چیک کر رہے ہیں۔ اشرف غنی تعمیر نو کے ادارے کے انچارج کی حیثیت سے واپس افغانستان آئیں گے۔ جہاں سے وہ مختلف ممالک میں موجود افغان ماہرین بیوروکریٹس پروفیسر ڈاکٹرز انویسٹرز معاشرتی اور سیاسی حلقہ اثر رکھنے والوں سے رابطے کر کے انہیں افغانستان کی تعمیر نو میں شریک کریں گے۔ امید ہے طالبان دوسرے افغان گروہوں کے ساتھ ہمہ شمول حکومت میں حصہ بقدر جثہ پائیں گے۔

قطر میں موجود ہزاروں افغان فوجی واپس افغانستان آکر ڈیوٹی سنبھالیں گے، افغانستان میں قانونی حکومت آئے گی تو بین الاقوامی پذیرائی کے ساتھ ساتھ امدادی اور سماجی خدمات ادا کرنے والے عالمی ادارے اس کے ساتھ مدد کے لئے آئیں گے، جس کا جتنا فائدہ افغانستان کو ہو گا اس سے زیادہ پاکستان کو ہو گا، کیونکہ پاکستان کا اقتصاد امن اور خوشحالی افغانستان کے امن اور جمہوریت سے وابستہ ہے۔

پاکستان کی پختون قوم پرست جماعتوں میں محسن داوڑ کی این ڈی ایم کے علاوہ محمود خان اچکزئی اپنی باقی ماندہ پارٹی کے ساتھ افغان امن اور ڈیورنڈ لائن کے دونوں اطراف رہائش پذیر پختونوں کے روشن مستقبل کے لئے مصروف عمل ہیں۔ افغانستان کے یوم استقلال کی فنکشن میں افغان ایمبیسی اسلام آباد میں محمود خان اچکزئی کی شرکت اور طالبان حکومت کے لئے خود کو ان کا سفیر بنانے کے اعلان نے ان کی پارٹی کے قریبی اور دیرینہ ساتھی ان سے الگ کر دیے، لیکن افغان امن کی خاطر مذکورہ قربانی دے کر انہوں نے اپنی دانش اور تدبر کا امتحان پاس کر دیا ہے۔

اے این پی ماضی کی طرح اس عمل سے بھی باہر اور بے خبر ہے، اس لیے ان کا کچھ بھی داؤ پر نہیں لگا ہوا ہے۔ ان کے پاس ایسے معاملات میں بر وقت حصہ لینے کی صلاحیت اور دوراندیشی باقی رہ گئی ہے اور نہ وہ اس تاریخی فیصلے میں اپنا فیصلہ کن کردار ادا کرنے کے لئے تیار ہے۔ مستقل امن اور آنے والی نسلوں کی ترقی اور خوشحالی کی خاطر پرانی دشمنیاں اور مخاصمتیں بھلا کر آگے بڑھنا ضروری ہے، ہم تاریخ اور جغرافیے کی قید میں ہو سکتے ہیں لیکن ماضی کی غلطیوں کو سینے سے لگانا دانشمندی نہیں خواہ وہ غلطیاں ہماری ہوں یا ہمارے مخالفین کی۔ تیونس کے نہضہ پارٹی کے رشید غنوشی کی طرح سب نے سب کو معاف کر کے وطن کی خاطر آگے بڑھنا ہو گا۔

اس سارے آپریشن کو مستقبل میں بہتر انداز سے چلانے کے لئے جنرل باجوہ کے کسی معتمد جرنیل کی اونچی کرسی پر موجودگی ضروری ہے بصورت دیگر انہیں ایک اور ایکسٹینشن دینی ہو گی۔

تخلیقی اور تجزیاتی ملکہ بمشکل ایک دماغ میں یکجا ہوتا ہے۔ تخلیقی استعداد سرکش، خودرو، فطری، سادہ اور اوریجنل ہوتی ہے۔ جیسے دشت وصحرا کا خودرو پھول جو کسی بھی باغبانی، کانٹ چھانٹ اور آبیاری وسینچائی سے بے نیاز ہوتا ہے۔ جبکہ تجزیاتی صلاحیت بار بار کی مشق وتمرین، طویل مطالعے، گہرے مشاہدے اور بھرپور تربیت کے بعد وجود میں آتی ہے۔ تجزیہ آرائش وزیبائش، منطق رکھ رکھاؤ، ٹھنڈے اور دھیمی ڈی کنسٹرکشن اور ری کنسٹرکشن کا نام ہے۔ سو صاحبانِ قلم کی اکثریت یا تو تخلیقی ہوتی ہے یا تجزیاتی۔ ہاں ان میں ایک مخصوص اقلیت ایسی ضرور رہی ہے جو تخلیق اور تجزیے کا ملکہ ایک ساتھ رکھتے ہے۔ جس دماغ میں تخلیقی ملکہ اور تجزیاتی استعداد بیک وقت موجود ہوں، وہاں جینئیس جنم لیتا ہے۔ انہی نابغوں کے اس چھوٹے سے گروہ کا ایک فرد شاہ زار جیلانی ہیں، جو تخلیق کاروں میں تخلیق کار اور تجزیہ نگاروں میں پائے کے تجزیہ نگار ہیں۔

ثانیاً، قلم کی مہارت زبان کی مہارت کے ساتھ بہت کم دیتی ہے۔ اعلیٰ پائے کے قلمکار عموماً دنیا سے الگ تھلگ، اپنے آپ میں مگن رہتے ہیں۔ ان کے وظیفے کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے جو اسے ہجوم میں گھلنے ملنے سے منع کرتی ہے۔ یہ خلوت کے باسی جلوت سے دور، تنہائی کے خوگر اور محفلوں سے الگ رہتے ہیں۔ قلم کی دنیا سکون اور سکوت کی دنیا ہے، آواز اور خطابت کی نہیں لیکن گفتگو اور خطابت کی اپنی وقعت ہے۔

گفتگو کے ماہر conversationalist کو خطیب، مقرر، سیاست دان، مسحور کن اور کرشماتی شخصیت کہا جاتا ہے۔ اِنّ مِنَ البَیانِ لَسِحراً، اسی لسانی روانی کا اظہار ہے۔ زبان کی سحر وہاں پختہ ہوتی ہے جہاں صاحبان سماعت موجود ہو، لسانی جوہر کو پالش کرنے کیلئے محفل کی وجود شرط اوّل ہے۔ سو قلم اور بیان کی مہارت اگر ایک دوسرے کی ضد نہیں تو دوست بھی نہیں ہیں۔ یہ ایک اور کمیاب اقلیت ہے جن کی قلمی مہارت ان کے بیاں کی مہارت کے ساتھ متوازی جاری ہو۔ قلم وبیاں کی مہارت کو یکجا کرنے کی بات آئے تو شاہ زار جیلانی کے جاننے والوں کے ذہن میں بے ساختہ ان کا خیال آتا ہے۔ شاہ صاب لکھنے پر آئے تو تحریر کی آمد، تازگی، اوریجنلٹی، بوقلمونی، بے ساختگی، منطقیت، معقولیت، تجزیے میں بے مثال، اور بولنے پر آئے تو حاضر جوابی، جملہ بازی، حس مزاح، آواز والفاظ کی جادوگری میں بے ہمال۔ بلاشبہ شاہ صاحب ماسٹر پولٹیکل ریزنر اور پختون ایشو پر قابل اعتماد اتھارٹی ہیں۔

شاہ صاب کی شخصیت تجزیہ کی تحت آنے سے گریزاں ہے تو ان کی ذات کا موزانہ بھی اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ایسی کسوٹی یا پیمانہ کہاں ہوگا جس سے اس سرکش نابغے کی انٹلکٹ ناپنا ممکن ہو؟ اپنی امتیازی اوصاف کی بناء پر شاہ زار جیلانی اپنی تعریف définition آپ ہیں۔ جو انہیں نہیں جانتے وہ کہتے ہیں شاہ صاحب کم گو محفل گریز یا مغرور ہیں، لیکن جو جانتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ اس کی قہقہہ بار محفل میں بیٹھے رہیں اور علم، نکتہ آفرینی اور بذلہ سنجی کا حظ اٹھائے۔

وہ جس انٹلکچول کلاس سے تعلق رکھتے ہیں اس کو انہوں نے خود تشکیل دیا ہے اور جہاں اتنی متضاد صفات اتنی خوبصورتی اور سرکشی یکجا ہوں وہاں تجزیہ اور تعارف کون کرسکتا ہے!

رشید یوسفزئی